جنوری
2022ء

بیاد امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ

# جہانِ رضا

لاہور

## یادگارِ ضیاءُ الدین لاہوری

عظیم محقق، نقاد اور تاریخ دان ضیاءُ الدین لاہوری مرحوم کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین



چیف ایڈیٹر
محمد کاشف رضا

مرکزی مجلسِ رضا ○ لاہور

امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کا ترجمان، اخلاقی، ادبی، تمدنی جریدہ

ماہنامہ

# جہانِ رضا لاہور

جلد نمبر 28، جمادی الثانی، 1443ھ، جنوری 2022، شمارہ 1

○ بانی مجلس رضا: حکیم اہلسنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

○ بانی ماہنامہ: پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

● چیف ایڈیٹر: محمد کاشف رضا ● اعزازی ایڈیٹر: عامر ابراھیم الاشعری



قیمت -/50 روپے

خط و کتابت اور ملنے کا پتا

دفتر ماہنامہ جہانِ رضا ظہور پلازہ
دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور
0333-7861895 - 0300-1090045

اداریہ

# ضیاء الدین لاہوری۔ کچھ یادیں کچھ باتیں

جناب ضیاء الدین لاہوری مرحوم کے نام سے میرے کان لڑکپن میں ہی آشنا ہو چکے تھے، لاہور میں دو مقامات پہ وہ آتے تھے، جہاں علمی مجالس لگتی تھیں، میری خوش نصیبی تھی کہ میں دونوں جگہوں پہ حاضر ہوتا تھا، ایک ریلوے روڈ پہ حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری کا مطلب اور دوسرا جناب محمد شفیع رضوی کا ہجویری کُتب خانہ چوک اُردو بازار، یہاں جن لوگوں کا نام احترام سے لیا جاتا، میرا دل اُن کے احترام میں آج تک دھڑکتا ہے۔ ضیاء الدین لاہوری بھی اُن شخصیات میں سے تھے، جن کا نام یہاں محبت سے لیا جاتا تھا۔

برسوں میری لاہوری صاحب سے نشست و برخاست رہی، علمی مذاکرے ہوئے، تحقیق کا تبادلہ ہوا، تاریخ کے خشک ترین موضوعات پر گھنٹوں گفتگو ہوئی، بارہا میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوا، کئی بار وہ میرے پاس تشریف لائے، ان تمام ملاقاتوں میں میرے احساس کے لئے جو بات باعثِ راحت تھی وہ یہ کہ مرحوم نہ منافق تھے نہ خود پسند، سچی باتیں، دھیمے لہجے میں کرنے والے ضیاء الدین لاہوری نہایت عاجز، شگفتہ مزاج اور علم دوست تھے۔ میں نے اِن تمام اوصاف کا مطالعہ ان کی شخصیت میں ہر بار کیا۔

مجھے مرحوم نے کئی مرتبہ بتایا کہ ہمارے گھر ''گیارہویں شریف'' کے ختم پر بریلی سے مولانا سردار احمد صاحب (محدث اعظم پاکستان) تشریف لایا کرتے تھے، علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب اور دیگر علماء بھی بیان فرمایا کرتے تھے'' مجھے یہ بھی بتایا کہ ''میرا بڑا بیٹا خالد اعجاز جب سعودیہ گیا اور مولانا ضیاء الدین مدنی سے بیعت ہونے گیا تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ پہلے اپنے والد سے اجازت لو۔ تو خالد اعجاز نے مجھ سے خط لکھ کر اجازت چاہی تو میں نے خوشی سے اجازت دے دی'' انہوں نے لندن میں دورانِ قیام مولانا عبدالستار خان نیازی سے ملاقاتوں کے احوال بھی سُنائے۔ خاص طور

پرایک واقعہ وہ سناتے تھے کہ ''میں پاکستان سے واپس نیا نیا لندن گیا تھا تو وہاں مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی (مہتمم جامعہ نظامیہ رضویہ) سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے چند سو پونڈ دیے کہ یہاں جب تک آپ کماتے نہیں ان سے گزارہ کریں''

1857ء اور سرسید احمد خاں، مرحوم کے خاص موضوعاتِ تحقیق تھے، 1857ء ہماری تاریخ کا کرب ناک موڑ ہے، 1857ء کی جنگ آزادی (جہاد) کے سب سے بڑے ہیرو علامہ فضلِ حق خیرآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ پر انہوں نے ایک تحقیقی مضمون سپردِ قلم کیا، جس میں اپنے ایک معاصر افضل حق قرشی کے ''مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور جہادِ آزادی'' کے جھوٹ اور فریب سے پُر مضمون کا ''پوسٹ مارٹم'' کیا ہے۔ افضل حق قرشی تادمِ تحریر ان تاریخی حقائق کا جواب نہیں دے سکے۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت کے حوالے سے سرسید شناسوں نے جو مغالطے اور مبالغے پھیلا رکھے ہیں، مرحوم نے برس ہا برس کی تحقیق سے سرسید کے عقیدہ وفکر سے لے کر انکی ملی وقومی خدمات کی حقیقت طشت از بام کر دی ہے۔ سرسید پر بلاشبہ وہ پاک و ہند میں ایک ''اتھارٹی'' تھے۔ علی گڑھ سے لے کر لاہور تک کوئی ایک بھی ایسا سرسید شناس نظر نہیں آتا جو مرحوم کی سرسید پر کی گئی تحقیق کا علمی و تحقیقی رد کر سکا ہو۔

جناب ضیاء الدین لاہوری کے انتقال سے ایسا تحقیقی وفکری خلا پیدا ہوا ہے، جسکا مدتوں پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا، مگر جس قدر جاندار کام انہوں نے کر دیا ہے مدتوں یاد رکھا جائے گا، تاریخ وتحقیق کا طالب علم ان کی کُتب سے رہنمائی لیتا رہے گا، مرحوم کی کمی سے تحقیق وتالیف کا فن سوگوار رہے گا۔ نقد ونظر کے پیانے چھلک جائیں گے، دل سخت رنجیدہ ہے کہ نمائشی محقق دندناتے پھریں گے، حقیقی محقق ملکِ عدم کا راہی ہوا، میں علم وتحقیق سے تعزیت کرتا ہوں کہ علم و تحقیق کا کارواں چلتا رہے گا، مگر 2022ء سے ضیاء الدین لاہوری اس میں نہیں ہوں گے۔

# خودنوشت چند یادداشتیں

ضیاءالدین لاہوری

## بچپن

میری پیدائش جولائی 1935ء میں لاہور کے علاقہ گڑھی شاہو میں ہوئی۔ ہمارا خاندان کئی پشتوں سے اِسی علاقے میں رہائش پذیر چلا آرہا تھا۔ والدصاحب ریلوے ورکشاپس مغل پورہ میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ دینی مزاج کے حامل تھے۔ اگرچہ اُن کی تعلیم معمولی تھی مگر وہ اچھی طرح لکھ پڑھ لیتے تھے۔ اُن کے پاس مذہبی کتابوں کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ تھا جو اکثر اُن کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ وہ علماءِ کرام کی مجالس میں بیٹھنے کو بہت سعادت سمجھتے تھے۔ اُنہیں مسجدیں آباد کرنے اور اُن کی خدمت کا بہت شوق تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ ایک ہی مسجد کے ساتھ منسلک ہوکر رہ گئے۔ قدیم طرز کی تعمیر شدہ یہ مسجد میرے بچپن کے ایام میں ایک چھوٹے سے احاطے میں تھی اور اِس کے دائیں بائیں کی زمین خالی تھی۔ والدصاحب نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اسے آباد کرنے کی ٹھانی اور اہلِ علاقہ کے تعاون سے اُسے ایک حد تک وسیع کیا۔ پھر یہ مسجد علاقہ کی واحد عیدگاہ بن گئی اور عیدگاہ ہی کے نام سے معروف ہوئی۔ ملازمت کے اوقات اور رات کی نیند کے علاوہ والدصاحب کا زیادہ وقت یہیں بسر ہوتا تھا۔ یہ وہ مسجد ہے جو اِن دنوں ''جامعہ نعیمیہ'' کہلاتی ہے۔

والد صاحب بڑے خوش الحان مؤذن تھے۔ ایک بار وہ ایک مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اذان دے رہے تھے کہ ایک انگریز جوڑے کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُنہیں اذان کا لہجہ بھلا محسوس ہوا تو باہر کھڑے ہوکر اُس سے محظوظ ہونے لگے۔ جب والدصاحب اذان دے کر نیچے اُترنے لگے تو وہ خالص انگریزی لہجے میں بولے ''اَور گاڈ..... اَور گاڈ''۔

والد صاحب اُن کی اِس بات پر ہنس دیے اور آہستہ آہستہ الفاظ بول کر اُنہیں اذان کے وقت اور اِس کی ادائیگی کا فلسفہ سمجھایا اور اُن کی فرمائش قبول کرنے سے معذرت کرلی۔

## ابتدائی تعلیم

وہ دَور پلے گروپ، نرسری اور پریپ کلاسوں کا زمانہ نہیں تھا اور نہ مشنری سکولوں کے سوا اِس درجے کی تعلیم کے لئے پرائیویٹ سکولوں کا کوئی رواج تھا۔ مسلمان بچوں کی تعلیم مسجدوں سے شروع ہوتی تھی۔ علاقے کی ہر مسجد کا امام وہاں لائے جانے والے بچوں کو ناظرہ کی مفت تعلیم دینے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ میری پڑھائی کی شروعات بھی اِسی طرح ہوئی اور تقریباً سات برس کی عمر میں ناظرہ کی تعلیم تکمل ہوگئی۔ اِسی دوران چھ برس کی عمر میں کتابی تعلیم کے لئے علاقے کے پرائمری سکول میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ سکول شہر کے ہر علاقے میں میونسپل کارپوریشن کی جانب سے قائم تھے اور اِن میں کسی قسم کی ٹیوشن فیس نہیں لی جاتی تھی۔ اِن سکولوں میں ''ماسٹر صاحب'' کی کرسی یا میز کے سوا طلبا کے لئے کسی قسم کے بنچ کا بھی تصور نہ تھا۔ بچوں کی مسند ٹاٹ ہوتی تھی۔ اُردو اِملا خوشخط انداز میں لکڑی کی تختی پر کائی کی قلم کے ساتھ لکھی جاتی تھی اور ریاضی کے سوالات سلیٹوں پر حل کئے جاتے تھے۔ پرائمری سکول چار درجوں تک ہوتے تھے اور ہائی سکولوں کی پڑھائی پانچویں جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ ناظرہ پر عبور کر لینے اور والد صاحب کی کتابوں کے ذخیرے کے مطالعہ کو اپنی عادت بنا لینے کے باعث میں اُردو پڑھنے لکھنے میں کوئی دِقت محسوس نہیں کرتا تھا۔ کتاب کا نیا سبق پڑھائے جانے سے قبل ہی اُسے فرفر پڑھ لینے، اِملا میں غلطیاں نہ کرنے اور خوش خط لکھائی کے باعث مجھے شاباش ملتی رہتی تھی۔

## ہائی سکول میں داخلہ

پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہائی سکول میں داخل ہوا تو بیٹھنے اور لکھنے پڑھنے

کے لئے بنچوں اور ڈیسکوں کے استعمال کا شعور حاصل ہوا۔ یہ علاقے کا واحد ہائی سکول تھا جو پرائیویٹ طور پر قائم تھا اور دو روپے کے لگ بھگ ماہانہ فیس وصول کی جاتی تھی۔ جو لوگ اپنے بچوں کی فیسیں ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اُنہیں اُن کی مالی حیثیت کے مطابق مکمل یا نصف فیس معافی کی رعایت دی جاتی تھی۔ میں پڑھائی میں بہت دلچسپی لیتا اور اساتذہ کے ڈنڈوں کی مار سے اکثر محفوظ رہتا تھا۔ آبادی میں ہندو اور سکھ بھی ساتھ ساتھ بستے تھے اور اُن کے بچے ہمارے ساتھ ہی زیرِ تعلیم تھے۔ مجھے اپنے ہم جماعتوں میں سے چند ایک کے نام اور شکلیں ابھی تک یاد ہیں۔ پرائمری سکول میں سیتا رام، اوم پرکاش اور ہر بھجن سنگھ ہماری کلاس میں پڑھتے تھے اور ہائی سکول میں رام ناتھ ہمارا ہم جماعت تھا جو دینیات کے پیریڈ میں کلاس سے باہر بیٹھا ہوتا۔

## تحریکِ آزادی کے دوران

1947ء میں جب یہ تحریک زوروں پر تھی، میں چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد ساتویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ انگریز قوم کے ''صاحبوں'' اور ''میموں'' کی ظاہری عادتوں سے تو شناسائی تھی ہی کہ وہ ہمارے علاقے سے منسلک محکمہ ریلوے کی تعمیر کردہ کوٹھیوں میں رہائش پذیر تھے اور وہاں برٹ انسٹیٹیوٹ میں، جسے عام لوگ ناچ گھر کے نام سے پکارتے تھے، اُن کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں مگر اُن کی قوم سے آزادی حاصل کرنے کے تصور کا زیادہ شعور نہ تھا۔ اُن دنوں ہمارے علاقے میں دو تنظیمیں فوجی انداز میں پریڈ کیا کرتی تھیں۔ غازی فوج کے ارکان کے ہاتھوں میں میان میں بند تلواریں ہوتی تھیں اور علامہ مشرقی کے جیالے خاکسار کندھوں پر بیلچے اُٹھائے چلتے تھے۔ فسادات شروع ہوئے تو رات کا روزانہ کرفیو معمول بن گیا۔ ہماری گلی میں تھوڑی سی کھلی جگہ تھی جہاں اِردگرد کی گلیوں کے نوجوان ایک بغلی راستے سے یا کوٹھے ٹاپ کر آجاتے اور پریڈ کرتے۔ ہر گلی کے نوجوانوں کا ایک ڈیوٹی روسٹر بنایا جاتا اور وہ روزانہ رات کو گلی کے داخلے کے قریب

باری باری روزانہ پہرہ دیا کرتے تھے تا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے کسی جتھے کے اچانک حملے سے محلے داروں کو بچایا جا سکے۔ علاقے کے نوجوان اور بچے گلی محلّوں میں جلوس نکالتے اور پاکستان کے قیام کے حق میں نعرے لگاتے۔ اِن میں درجِ ذیل نعرے بہت مقبول تھے:

''لے کے رہیں گے پاکستان'' ''بن کے رہے گا پاکستان''

''سینے میں گولی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے''۔

بارہ سال سے بھی کم عمر ہونے کے باوجود میں جلسوں جلوسوں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ اُن دنوں باغ بیرون دہلی دروازہ میں روزانہ ایک جلسہ ہوا کرتا تھا جس کے بعد لوگ ایک بڑے جلوس کی شکل میں شہر کی سڑکوں پر نعرہ زنی کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں بھی اپنے بھائی جان کے ساتھ اِس بڑے جلوس میں شریک ہوا۔ یہ جلوس دہلی دروازہ سے سرکلر روڈ کے راستے انارکلی میں داخل ہوا۔ اکثر لوگوں نے بڑے بڑے رُومال بھگو کر اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے تا کہ اگر کسی جگہ پر پولیس جلوس کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس استعمال کرے تو وہ اُس کے اثرات سے بچنے کے لئے اُن سے اپنی آنکھیں بھگو لیں۔ ہم دونوں بھائیوں کے پاس رومال نہیں تھے۔ ہم اپنی قمیضوں کے اگلے حصے دستی نلکوں سے بھگوتے رہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُس روز ہمیں آنسو گیس سے واسطہ نہ پڑا۔ یہ جلوس انارکلی سے ہوتا ہوا نیلا گنبد میں داخل ہوا تو میں نے پولیس کی کئی گاڑیوں کے آگے گورکھا سپاہیوں کو جلوس کی راہ میں حائل مستعد کھڑے دیکھا۔ انہیں دیکھتے ہی جلوس میں شامل بہت سے لوگ گاڑیوں کی طرف لپک کر اُن کے اندر گھسنے لگے۔ میرے لئے یہ حیران کن منظر تھا۔ بھائی جان نے بتایا کہ یہ تمام لوگ پاکستان کے مطالبے کی حمایت میں رضاکارانہ طور پر گرفتاریاں پیش کر رہے ہیں۔ اُن میں سے اکثر افراد کو شہر سے کافی دُور لے جا کر ویرانے میں چھوڑ دیا جاتا اور پھر وہ ٹولیوں کی صورت میں بھٹک بھٹک کر اپنے علاقوں میں واپس پہنچتے۔

15 اگست 1947ء بروز جمعۃ المبارک پاکستان بن گیا۔ اِس روز سے ایک عرصہ قبل ہی مشرقی پنجاب سے، جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، مہاجرین کے قافلے لاہور میں داخل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ہزاروں لوگ ریلوے کی گاڑیوں کے ذریعے آرہے تھے۔ نہ صرف ریل گاڑیوں کے ڈِبّوں کے کمرے بلکہ اُن کی چھتیں بھی افراد سے بھری ہوتی تھیں۔ پھر بہت سے لوگ کچے پکے راستوں سے بیل گاڑیوں پر اپنے سامان کے ساتھ سفر کر رہے ہوتے تھے۔ میں نے بڑے خوفناک مناظر دیکھے جو میں اب بھی آنکھیں بند کر کے اُن کا تصور کروں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بے شمار لوگ زخمی حالت میں ہوتے تھے جن میں سے کسی کا بازو نہیں، کسی کی ٹانگ نہیں، کوئی اپنے چھوٹے چھوٹے مُردہ بچوں کو گود میں اُٹھائے آرہے ہوتے۔ کسی کا بیٹا، کسی کی بیٹی، کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کی بہن، کسی کی بیوی، کسی کے خاوند کو راستے میں سکھوں نے قتل کر دیا ہوتا اور وہ اپنی جانیں بچا کر ہجرت کر کے آرہے تھے۔ بعضوں کے ساتھ اُن کے شہید عزیزوں کی لاشیں ہوتیں جنہیں یہاں دفنا دیا جاتا۔ پھر بڑوں سے معلوم ہوتا کہ بہت سی خواتین کو راستے ہی میں اُن کے خاندان والوں سے چھین لیا جاتا تھا۔ اُن دنوں شہر کے سکول موسمِ گرما کی تعطیلات کے باعث بند تھے۔ بہت سے خاندانوں کو اُن عمارتوں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمارے علاقے سے ملحق ریلوے سٹیڈیم کی وسیع گراونڈ تھی جہاں ڈھیروں خاندان قیام پذیر ہو گئے۔ مقامی لوگ، جن میں والد صاحب بھی پیش پیش تھے، اجتماعی طور پر صبح شام اُنہیں کھانا اور دُوسری ضروریات مہیا کرتے تھے۔

**اپنے سکول ٹیچر کے لئے افطار کے وقت کی گئی بیماری کی دُعا قبول ہونے کا اتفاق**

میں دسویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہمارے ایک ٹیچر چودھری نصیر صاحب تھے جو ہمیں بڑی محنت سے ریاضی کا مضمون پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کا طریقۂ تدریس اتنا پُراثر تھا اور اُنہوں نے اِس مضمون میں لڑکوں کو اِس قدر طاق کر دیا تھا کہ میٹرک کے

سالانہ امتحان میں کوئی طالب علم فیل نہ ہوا۔ خود میں نے اِس مضمون میں تقریباً پورے نمبر حاصل کئے۔ یہ تو تھی امتحان کے بعد کی کیفیت، وہ سکول کے اوقات کے تقریباً دو گھنٹے بعد ہمیں دوبارہ بُلواتے اور بلا فیس پڑھایا کرتے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور رمضان کا مہینہ۔ ہم اُنہیں اِس مہینے میں کھاتے پیتے دیکھتے تھے۔ اِس کے برعکس میں سخت قسم کا روزہ دار واقع ہوا تھا۔ اِس عالم میں اوقاتِ سکول کے بعد دوپہر کو سخت گرمی میں گھر آنا اور دو گھنٹے بعد پھر سکول جانا میرے لئے بڑا سخت مرحلہ ہوتا تھا۔ ناغہ کرنا ناممکن تھا کیونکہ وہ اِس معاملے میں بہت سخت طبیعت کے مالک تھے اور ہوم ورک نہ کرنے اور ناغہ کرنے والوں کی تواضع بے شمار ڈنڈوں سے کیا کرتے تھے۔ جمعہ کے روز میں معمول کے مطابق نماز پڑھنے مسجد میں گیا۔ امام صاحب نے وعظ کرتے ہوئے روزے کی ایک فضیلت یوں بیان کی کہ "اللہ تعالیٰ اپنے روزہ دار بندوں سے اِس قدر خوش ہوتا ہے کہ افطار کے عین پہلے جو دُعا مانگی جائے، وُہ اُسے قبول فرماتا ہے"۔ مجھے یہ بات بہت اچھی لگی اور اُسے پلّے باندھ کر گھر آیا۔ اُس شام جب میں روزہ کھولنے لگا تو ہاتھ اُٹھا کر یہ دُعا کی: "یا اللہ، ہمارے ماسٹر صاحب خود تو روزے رکھتے نہیں اور ہمیں سخت دوپہر کو دوبارہ سکول بُلواتے ہیں جس سے ہمیں روزے میں سخت تکلیف ہوتی ہے مگر اُنہیں اِس کا ذرا احساس نہیں۔ یا مولا! اُنہیں بیمار کر۔"

اتفاق کی بات کہ جب ہم اگلے روز سکول پہنچے تو ماسٹر صاحب موجود نہ تھے۔ پتہ چلا کہ اُنہیں بخار ہو گیا ہے۔ چار پانچ روز بعد وہ سکول آئے اور باقاعدہ پڑھائی شروع کی۔ پیریڈ کے دوران مجھے یہ ڈر سا لگا رہا کہ کوئی لڑکا کہیں اُن سے سہ پہر کو آنے سے متعلق نہ پوچھ لے۔ جب پیریڈ ختم ہونے لگا تو ایک لڑکے نے یہ سوال کر ہی ڈالا کہ پہلے کی طرح دوبارہ سکول آنا ہے یا نہیں؟ ماسٹر صاحب نے اُس کی طرف متوجہ ہو کر شہادت کی اُنگلی دائیں بائیں پھیرتے ہوئے فرمایا:

''نہیں۔۔۔۔۔۔، رمضان کے بعد''

پھر کلاس کی جانب اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''کیونکہ تم میں سے جو روزہ دار ہیں، اُن کی بدُعا لگ جاتی ہے۔''

سادگی کی انتہا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہ میں پکڑا گیا ہوں اور اُنہیں میری ''کارروائی'' کا پتہ چل گیا ہے۔

## گُمنام خط کی کہانی

ہمارے یہی سکول ٹیچر چودھری نصیر لڑکوں کو ہوم ورک تھوک کی مقدار میں دیا کرتے تھے اور مکمل ہوم ورک نہ کرنے والے لڑکوں کی اچھی بھلی ''مرمّت'' کیا کرتے تھے۔ اُن کا یہ فرمان ہوتا تھا کہ جس نے پڑھائی کرنی ہے وُہ پورا کام کرے گا اور جس نے ایسا نہیں کرنا وہ سکول سے ہمیشہ کے لئے بھاگ جائے گا۔ گرمیوں کی تعطیلات کا کام ہزارہا سوالات کی صورت میں دیا گیا۔ دوسری طرف، جیسا کہ اب بھی ہمارے سکولوں میں گرمیوں کی تعطیلات میں تقریباً مہینہ بھر کے لئے دسویں جماعت کے طالب علموں کو میٹرک کے امتحان میں اچھی کارکردگی دکھانے کے لئے روزانہ دو تین گھنٹے کے لئے بُلوایا جاتا ہے، تعطیلات کے دوران ہم بھی سکول جاتے تھے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب سکول کی گراؤنڈ میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ لڑکوں کو روزانہ پڑھایا کرتے تھے۔ میں اگرچہ محنتی لڑکوں میں شمار ہوتا تھا مگر چودھری صاحب کا دیا ہوا ہوم ورک مجھے زبردست بوجھ دکھائی دیتا تھا۔ چھٹیاں شروع ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے مگر میں نفسیاتی دباؤ کے تحت ابھی اِس کام کو شروع بھی نہیں کر سکا تھا۔ اِس ذہنی کشمکش کے باعث ایک روز بیٹھے بیٹھے ایک خیال دماغ میں آیا۔ میں نے ڈاک خانہ سے تین پیسے کا ایک پوسٹ کارڈ خریدا اور ہیڈ ماسٹر شیخ عارف حسین صاحب کے نام ایک گُمنام خط لکھا جس میں چودھری صاحب کے دیئے ہوئے ہوم ورک کی ''زیادتی'' کے خلاف اپنی طرف سے بڑے مُدبّرانہ انداز میں دلائل

دئے۔ میں نے چودھری صاحب کی قابلیّت اور محنت کی تعریف کی مگر اُن کے دئے ہوئے ہوم ورک سے متعلق یہ دلیل پیش کی کہ کام کا اِتنا بوجھ دیکھ کر محنتی لڑکے بھی نفسیاتی دباؤ کے تحت ایسا نہیں کر پاتے لہٰذا اُنہیں زیادہ سختی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ خط اُنہیں مل گیا۔ اگلے روز ہیڈ ماسٹر صاحب نے پڑھائی شروع کرنے سے قبل لڑکوں سے ایک خط ملنے کا ذکر کیا اور جیب سے میرا خط نکال کر اُسے آہستہ آہستہ پڑھنے لگے۔ میری پیش کردہ ہر دلیل کے بیان کے بعد وہ ڈھیلے ڈھالے الفاظ میں اُس کی تائید بھی کرتے جاتے۔ سارا خط پڑھنے کے بعد وہ لڑکوں سے کہنے لگے کہ جس نے یہ خط لکھا ہے وہ بتا دے، وہ اُسے کچھ نہیں کہیں گے۔ میرے سوا کسی کو اِس کا علم تھا ہی نہیں لہٰذا کسی کے بتانے کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بار بار اطمینان دلانے کے باوجود کہ وہ خط لکھنے والے کو کچھ نہیں کہیں گے، ماحول پر خاموشی طاری رہی تو بڑے اعتماد کے ساتھ کہنے لگے کہ اب وہ خود اپنے ذریعے سے پتہ کریں گے۔ پھر اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

> ''اگر میں نے دو دِن میں خط بھیجنے والے کا پتہ نہ کر لیا تو میرا نام بھی
> شیخ عارف حسین نہیں۔''

دو دِن تو کیا، دو مہینے چھوڑ دس مہینے گزر گئے مگر اُنہوں نے کلاس میں پھر کبھی اِس کا ذکر نہیں کیا۔ دوسری جانب سب لڑکوں کے لئے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ تعطیلات کے بعد چودھری نصیر صاحب نے اُن سے ہوم ورک دکھانے کا ذکر تک نہ کیا۔ ہاں، ایک بار میرے ایک ہم ڈیسک قدیر نے، جو اُردو سپیکنگ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اُس روز کا ہوم ورک نہ دکھایا تو اُسے کھڑا کر کے کہنے لگے: ''تم بس ہیڈ ماسٹر صاحب کو خط لکھا کرو، گھر کا کام نہ کیا کرو''۔ وہ بے چارہ رونے لگا کہ اُس نے اُنہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اُس کے آنسو مجھ پر گر رہے تھے۔ مجھے اُس پر ترس بھی آ رہا تھا مگر میں بوجہ ''مجبوری'' اپنا راز ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

سارا سال پڑھائی ہوتی رہی۔ میٹرک کے امتحانات ہو گئے اور اُس کے دو اڑھائی ماہ بعد نتائج کا اعلان ہو گیا۔ اُن دنوں کامیاب طلبہ کو اپنے اپنے سکولوں سے امتحان میں کامیابی کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا جاتا تھا۔ میں بھی اپنا سرٹیفکیٹ لینے کے لئے سکول گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب قطار میں کھڑے ہوئے لڑکوں کو باری باری سرٹیفکیٹ جاری کر رہے تھے۔ میرے آگے ایک اُردو سپیکنگ خاندان سے تعلق رکھنے والا میرا ہم جماعت شفیق اپنی باری پر آگے بڑھا تو ہیڈ ماسٹر صاحب اُسے بڑے مشفقانہ انداز میں یوں مخاطب ہوئے:

"دیکھو شفیق، میں تمہیں بہترین کیرکٹر سرٹیفکیٹ دوں گا، مگر ایک شرط ہے۔

تم سچ سچ بتاؤ کہ موسمِ گرما کی تعطیلات میں جو خط مجھے ملا، وُہ تم ہی نے لکھا تھا؟"

شفیق اُنہیں اپنے "بے گناہ" ہونے کا یقین دلانے لگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اُسے بار بار مان جانے کے لئے کہتے رہے مگر وہ بے چارہ میری "خُفیہ کارکردگی" کا الزام کیسے قبول کر سکتا تھا؟ اُدھر میری حالت یہ تھی کہ میں اِس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ اُس کے بعد یہ سوال مجھ سے پوچھا گیا تو کیا میں جھوٹ بولوں گا؟ بہرحال یہ معاملہ بخوبی طے پا گیا۔ جب میری باری آئی تو اُنہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ میں اِس امر پر ایک مدت تک حیران رہا۔ سکول سے فراغت کے بعد مجھ پر ایک راز کا انکشاف ہوا۔ دو مختلف موقعوں پر میری تحریریں پڑھ کر دو افراد نے، جو اُردو سپیکنگ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، سخت حیرانگی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ کسی پنجابی سے ایسی اُردو لکھنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ میرا ذہن ماضی کی طرف منتقل ہوا اور خیال کیا کہ جب میرے خط پر ہیڈ ماسٹر صاحب اور چودھری صاحب کے درمیان گفتگو ہوئی ہو گی تو میری تحریر کے انداز نے اُنہیں اِس میں کسی پنجابی طالب علم کے "ملوث" ہونے کا شک نہیں ہونے دیا ہو گا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ میرے اُردو سپیکنگ ہم جماعتوں پر شک کا اظہار کیا گیا۔ اِس سے قبل مجھے قطعاً احساس نہ تھا کہ میری تحریر کو

دُوسرے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے بچپن ہی سے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ والد صاحب کی الماری میں ڈھیروں مذہبی کتابیں رکھی ہوتی تھیں اور میں اُنہیں بڑے شوق سے پڑھتا رہتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اِس عادت کے باعث میری تحریر میں نکھار آگیا ہو جو اِس واقعہ میں میرے "بری الذمہ" ہونے کا باعث ہوا ہو۔

## 1951ء کے انتخابات

اُس دَور میں صوبائی اسمبلی کے ہر علاقے سے دو ارکان منتخب ہوا کرتے تھے، ایک مقامی اور دُوسرا مہاجر سیٹ پر منتخب ہوتا تھا۔ یہ ارکان ایم۔پی۔اے نہیں بلکہ ایم۔ایل۔اے یعنی Member of Legislative Assembly کہلاتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے ذاتی طور پر 1951ء میں ہونے والے انتخابات میں "حقِ رائے دہی" استعمال کیا تھا حالانکہ میں اُس وقت صرف سولہ سال کا تھا اور یہ حق استعمال کرنے کا اہل نہ تھا مگر انتخابی فہرستوں میں میرا نام موجود تھا اور مجھے یہ شعور نہ تھا کہ کس عمر کا شہری ووٹ ڈالنے کا مجاز ہے۔ شناختی کارڈ کا تو کوئی تصوّر ہی نہ تھا۔ ہمارے علاقے میں احمد سعید کرمانی، جو ایک عرصہ بعد جنرل ایوب خاں کی کابینہ کے وزیر بنے، مسلم لیگ کے امیدوار تھے اور چوہدری عنایت اللہ "جناح مسلم لیگ" کے۔ پنجاب میں اوّل الذّکر لیگ کے رُوحِ رواں ممتاز محمد خاں دولتانہ تھے اور موٴخر الذّکر کے قائد نواب افتخار حسین ممدوٹ جنہوں نے مرکزی مسلم لیگ سے، جس کے قائد وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں تھے، بغاوت کر کے یہ جماعت قائم کی تھی۔ انتخابات کی یہ مہم اُس وقت شروع ہو چکی تھی جب میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ہماری درس گاہ اقبال ہائی سکول کے مالک میاں اقبال حسین کے بیٹے اکبر حسین بھی، جو غیر عوامی طبیعت کے مالک تھے، اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر شیخ عارف حسین صاحب کا خیال تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو سکول کے مالک کے بیٹے ہونے کی بنیاد پر وزیرِ تعلیم بن

سکتے ہیں۔ وہ صبح کے دعائیہ اجتماع میں ہمیں تلقین کرتے تھے کہ آپ اپنے والدین کو میاں صاحب کو ووٹ دینے پر قائل کریں اور اگر وہ نہ مانیں تو انہیں دھمکی دیں کہ وہ بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ وہ ایک روز سکول کے سارے طالب علموں کو ساتھ لے کر نواب ممدوٹ کی کوٹھی واقع حبیب اللہ روڈ پر جا پہنچے۔ وہاں ہم سے میاں اکبر حسین اور نواب ممدوٹ کے حق میں خوب نعرے لگوائے گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے اجتماع میں نواب صاحب کی موجودگی میں تقریر کرتے ہوئے اُنہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ تمام بچے آپ کے حمایتی ہیں۔ اُنہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے۔ وہ اپنے والدین کو مجبور کر دیں گے کہ وہ میاں اکبر صاحب کو ووٹ دیں، لہٰذا اُنہیں اپنی جماعت کا ٹکٹ دیا جائے۔ اپنی تقریر میں اُنہوں نے نواب صاحب کو قائل کرنے کے لئے بچوں کی بھوک ہڑتال کے فرضی وعدے کو بنیاد بنایا۔ نواب صاحب ایک گھاک سیاست دان تھے، وہ اُن کی باتوں میں نہ آئے اور میاں صاحب کو آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب میں حصہ لینا پڑا۔ بالآخر جب انتخابی نتائج سامنے آئے تو ہمارے میاں صاحب کا نام ضمانت ضبط ہونے والی شخصیتوں میں سرِ فہرست تھا۔

### کراؤن سینما لاہور کا قصہ

مطالعہ کی عادت تو مجھے تھی ہی، لکھنے کی مشق کی فراوانی قدرتی طور پر ایک علاقائی سماجی مسئلے نے مہیا کر دی۔ علاقے میں ایک نئے سینما کی عمارت کی تعمیر پر بعض مقامی افراد نے احتجاجی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ مخالفت کا جواز یہ تھا کہ اِس عمارت کے ارد گرد ڈھیروں معروف اور غیر معروف تعلیمی ادارے چل رہے ہیں، اس لئے سینما کے اجرا سے علاقے کا سماجی ماحول خراب ہونے کا خدشہ ہے کیونکہ جن علاقوں میں سینما چل رہے ہیں، وہاں اکثر بدمعاشی اور غنڈہ گردی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کی خبریں اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں۔ بھاٹی دروازہ اور رائل پارک سے ملحق میکلوڈ روڈ اور ایبٹ

روڈ، جہاں بہت سے سینما چل رہے تھے، وہاں آئے دن ہونے والی غیر اخلاقی اور غیر سماجی سرگرمیوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ ہماری موجودہ نسل اُس دَور کی اِس کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتی کیونکہ آج ماحول بہت کچھ بدل چکا ہے بلکہ سینماؤں کا وجود تک ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اُس دَور میں یہ کیفیت نہ تھی۔ عام لوگوں کے لئے سینما ہی ایک سستی تفریح تھی اور غیر سماجی سرگرمیوں کا مزاج رکھنے والے لوگوں نے سینماؤں کی عمارتوں کے اردگرد کی آبادیوں میں اپنے اڈّے قائم کر رکھے تھے۔

اِس سینما کی بنیاد قیامِ پاکستان سے ایک سال قبل پنجاب اسمبلی میں ایک عرصہ تک سپیکر رہنے والے سر شہاب الدین مرحوم نے اپنی کوٹھی کے نزدیک رکھی تھی۔ ہمارے بچپن میں اُن کی رہائش ''شہاب دین کی کوٹھی'' کے نام سے معروف تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے اِس عمارت کا نام ''المتاز'' رکھا۔ سر شہاب الدین نے اُن کی پرورش اِسی عمارت میں کی تھی۔ سینما کے خلاف احتجاج اُن کے دَور ہی میں شروع ہو گیا جس کے باعث اِس کی تعمیر رُک گئی اور کئی برس تک رُکی رہی۔ بالآخر ایک اَور پارٹی نے اِس عمارت کو خرید لیا اور اِس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے زور و شور سے کام شروع کر دیا۔ اِس کے ساتھ مخالفت کی تحریک بھی زور پکڑنے لگی۔

یہ احتجاجی مہم ایک مقامی مذہبی تنظیم کے پلیٹ فارم سے جاری تھی۔ ''انجمن مُحبانِ رسول'' کے نام سے یہ تنظیم بنیادی طور پر مسجد عید گاہ (موجودہ جامعہ نعیمیہ) کی تعمیر اور اُس میں دینی سرگرمیوں کے اجرا کے سلسلے میں قائم ہوئی تھی۔ والد صاحب اِس کے قیام کے محرّک اور فعال رُکن تھے اور بیشتر کام اُن کے مشوروں سے ہوتے تھے مگر انجمن کے دفتری لوازمات سے نابلد ہونے کی بنا پر کوئی عہدہ سنبھالنے سے غیر متعلق تھے اور دِن رات مسجد کی خدمت میں مگن رہتے تھے۔

یہ 1954ء کا آغاز تھا اور میری عمر ساڑھے اٹھارہ برس تھی۔ اگرچہ میں اِس مہم کے

خاموش ہمدردوں میں شامل تھا مگر یہ دیکھ کر کُڑھتا تھا کہ انجمن مذکور سینما کی تعمیر کی مخالف ہے جبکہ اِس تنظیم کے صدر ایبٹ روڈ کے ایک سینما کے مالک ہیں۔ میں نے ایک معروف اخبار کو ایک مراسلہ اس کیفیت سے متعلق اشاعت کے لئے بھیجا مگر وہ اشاعت سے محروم رہا۔ دوبارہ بھیجا، پھر بھی اشاعت نہ ہوئی تو مجھے ایک ''طریقۂ واردات'' اختیار کرنا پڑا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر یہی مضمون اُسی اخبار کو بھیجا جس میں اپنے نام کے ساتھ ایک شوقیہ تخلص ''مُفتی'' استعمال کیا تو وہ شائع ہو گیا۔ غالباً اخبار والوں نے اُسے اِس خیال سے شائع کر دیا کہ مراسلہ نگار کسی اسلامی مدرسے کے سند یافتہ کوئی مُفتی ہوں گے۔ اِس کی اشاعت پر مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے اخبارات میں ''سینما توڑ کمیٹی'' کے نام سے ایک تنظیم کے قیام کا اعلان کر دیا جس کا سیکرٹری خود ٹھہرا۔

اِس دوران زیرِ تعمیر سینما کی عمارت مکمل ہو چکی تھی اور اب مسئلہ اِس کے اجرا کا تھا۔ عمارت کے عین مقابل ایک پرائمری سکول کے برآمدے میں لاہور کارپوریشن کی جانب سے ایک پبلک ریڈنگ روم قائم تھا جہاں متعدّد اخبارات آتے تھے۔ روزانہ وہاں جانا اور سارے اخبار چٹ جانا میرا معمول بن چکا تھا۔ اِس کے علاوہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانوں میں بُک سٹالوں کا چکر لگایا کرتا تھا جہاں اخباروں اور رسالوں کی ورق گردانی پر کوئی قدغن نہ تھی۔ میں وہاں جس رسالے میں اپنے مطلب کا مواد دیکھتا، خرید لیتا ۔ اِس طرح مجھے سینما کے مسئلے پر شائع ہونے والی بہت سی تحریروں تک رسائی ہو جاتی۔ سینما کے اجرا کے مخالفین کی مساعی کے مقابلے میں ایک حلقہ سینما کی حمایت میں مستعد ہوا۔ میں ہر مخالف تحریر کا مدلّل جواب شائع کروانے لگا۔ اِس طرح لاہور کے بیشتر اخبارات کے مراسلات اور صحافی لکھاریوں کے کالموں میں اِس مسئلے پر بحث و مباحثے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بعض اخبارات اور رسائل اِس مسئلے پر اداریے بھی لکھنے لگے۔

اِس ساری مہم میں مزے کی بات یہ ہے کہ احتجاجی تحریک والوں کی ناک کے نیچے

ہونے کے باوجود اُنہیں اپنی حمایت میں سرگرم محرّک ''ناچیز'' کی شناخت نہ تھی کیونکہ میرے نام کے ساتھ مُفتی کا لفظ مسلسل استعمال ہورہا تھا۔ میں خود اُنہیں اپنے متعلق بتانا نہ چاہتا تھا۔ اِس کی بڑی وجہ میرا یہ خدشہ تھا کہ انجمن مذکور کے فعال رُکن ہونے کے باعث والد صاحب کو اگر پتہ چلا کہ اُن کے صدر کے خلاف شائع ہونے والا مراسلہ میری کارستانی تھی تو وہ مجھ سے خفا ہوں گے حالانکہ والد صاحب ذہنی طور پر میرے ہم خیال تھے۔ وُہ صرف مسجد کے معاملات میں مگن رہتے تھے اور طبعاً اخباری سرگرمیوں کے سلسلے میں غیر فعال تھے۔ ایک موقع پر اُن کے ساتھیوں کو شک گزرا کہ کہیں یہ سینما کے مالکان کی کوئی چال نہ ہو۔ وہ یوں کہ خود ہی کسی نام پر تنظیم قائم کرکے اربابِ اختیار کو مخالفین ہونے کی نمائندگی کا تاثر دیا جائے اور پھر اندرونِ خانہ تنظیم کی جانب سے کسی بنیاد پر مصالحت کا ماحول پیدا کرکے حکومت سے سینما کے اجرا کا اجازت نامہ حاصل کرلیا جائے۔ اُنہوں نے اِس امر کی کھوج شروع کی کہ یہ شخص کون ہے۔ سارے علاقے میں میرا ایک ہی ہم نام تھا اور اُن سب کا نہایت قریبی دوست، لہٰذا وہ مشکوک افراد کی فہرست سے خارج تھا۔ میں اپنی خاموش طبیعت کے باعث اتنا سادہ دکھائی دیتا تھا کہ اُنہیں مجھ سے اِن سرگرمیوں کی قطعی توقع نہ تھی اور نہ وہ یہ یقین کرسکتے تھے کہ اٹھارہ برس کی عمر کا ایک شرمیلا سا لڑکا، جسے کبھی مجلسی زندگی میں شریک نہیں دیکھا گیا، اِس قدر متحرک ہوسکتا ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے قابلِ اعتماد قریبی دوستوں کو ''پکّا'' کررکھا تھا کہ وہ میری سرگرمیاں کے متعلق کسی کو نہیں بتائیں گے مگر شاید انجمن والوں نے کوشش کرکے اُن میں سے کسی سے سُن گُن پالی جو ایک روز سیکرٹری صاحب مجھ سے مل کر سینما کے اجرا کے مسئلے پر گفتگو کرنے لگے۔ میں کافی دیر تک جان بوجھ کر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتا رہا۔ آخرکار اُنہوں نے ناصحانہ انداز میں مجھ سے کہا کہ ''ہمارے حق میں جو اخباری سرگرمیاں جاری ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نیک کام تم کررہے ہو۔ اگر تم ہمیں بتادو کہ ہمارا خیال صحیح ہے تو ہم

بے فکر ہو جائیں ورنہ ہم سمجھیں گے کہ یہ مالکان کی کوئی سازش ہے، للہذا ہم اخبارات میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ سینما توڑ کمیٹی کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں''۔ اِس صورتِ حال پر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ میں اپنی'' کارروائیوں'' کو تسلیم کرلوں۔ پھر میں اُن بڑوں کی احتجاجی تحریک کا ایک باضابطہ حصہ بن کر مجلسی زندگی کے آداب اور طریقِ کار سے واقف ہونے لگا۔ اُن کے وفود وقتاً فوقتاً ممبرانِ اسمبلی، صحافیوں اور اخبارات کے مدیران وغیرہ کے ساتھ ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ شروع شروع میں تو میری کیفیت محض ایک خاموش تماشائی کی سی رہی مگر وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ اُن کی گفتگو میں شرکت کرنے لگا۔ اخبارات میں ''نوائے وقت'' احتجاجی تحریک کا مکمل حامی تھا اور اس کے مدیرِ اعلیٰ حمید نظامی مرحوم سے ہماری اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوتی تھی۔ اُن کے سٹاف رپورٹر عرفان چغتائی، جو بعد میں چند دیگر صحافیوں کے ساتھ پی۔ آئی۔ اے کی ایک آزمائشی پرواز کے دوران قاہرہ کے نزدیک ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے، اِس سلسلے میں بہت مُستعد تھے اور اپنے اصل نام کے علاوہ ''خاموش تماشائی'' کے قلمی نام سے لکھے جانے والے کالم ''لاہور کے شام وسحر'' میں اِس موضوع پر اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔ اِسی اخبار میں مولانا چراغ حسن حسرت نے بھی ''سندباد جہازی'' کے قلمی نام سے لکھے جانے والے کالم ''حرف وحکایت'' میں اظہارِ خیال کیا۔ روزنامہ ''امروز'' کے مدیرِ اعلیٰ (محمود علی قصوری) سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات میں اُنہوں نے ہمارے وفد کے ساتھ سخت رویہ اپنایا۔ ''احسان'' کے مدیرِ اعلیٰ ملک نور الٰہی کو میں اِس سلسلے کی ایک خبر کی اشاعت کے لئے گیا تو وہ مجھ پر معترض ہوئے۔ دینی مزاج رکھنے والے اخبارات ورسائل ہمیشہ ہماری حمایت میں لکھا کرتے تھے۔

پنجاب اسمبلی میں ہمارے حلقے کے منتخب ارکان سید احمد سعید کرمانی اور چوہدری

عنایت اللہ سے ہماری اکثر ملاقاتیں اُن کے گھروں پر ہوتیں۔ سوائے ماڈل ٹاؤن کے آج کی مانند ماڈرن آبادیاں ابھی قائم نہیں ہوئی تھیں اور یہ لوگ گنجان آبادیوں کے پُرانے محلہ جات ہی میں رہائش پذیر تھے۔ کرمانی صاحب قلعہ گوجر سنگھ کے گیٹ کے سامنے عبدالکریم روڈ پر رہتے تھے جبکہ چوہدری صاحب کا مکان گڑھی شاہو کے گنجان آباد مرکزی علاقے کی ایک بند گلی میں واقع تھا۔ ہم اُن کے ہاں اُنہیں اِس مسئلے کو اسمبلی میں اُٹھانے پر قائل کرنے کے لئے جایا کرتے۔

ہم ایک خاتون رکن اسمبلی باجی رشیدہ سے تعاون حاصل کرنے کے لئے اُن سے ملا کرتے تھے۔ وہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور اسمبلی کے اجلاس میں بھی بُرقعے میں ملبوس تقریر کیا کرتی تھیں۔ ہم جب اُن کی رہائش گاہ، جو بوہڑ والا چوک کے نزدیک تھی، جاتے تو ہمیں اُن کے کمرے سے باہر برآمدے میں کرسیوں پر بٹھا دیا جاتا اور وہ جالی دار دروازے کے پیچھے بیٹھ کر ہم سے گفتگو کرتیں۔

مسلم لیگ کے ایک نامور قائد میاں امیر الدین مرحوم کی رہائش گاہ واقع پانی والا تالاب پر بھی جانا ہوتا۔ اُن کے بھائی میاں امین الدین اُن دنوں پنجاب کے گورنر تھے اور مسئلہ اِس حد تک پہنچ چکا تھا کہ سینما کے اجرا کے لئے گورنر کے احکامات کی اجازت درکار تھی۔ میاں امیر الدین کے صاحبزادے میاں صلاح الدین بھی گفتگو میں شریک ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیں یقین دلاتے تھے کہ جب تک چچا جان گورنر ہیں، آپ بے فکر رہیں، وہ اجازت نہیں دیں گے۔

ہمارے علاقے میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے ایک رُکن نے ایک چھوٹی سی دُکان میں ہوٹل بنا رکھا تھا جو "حافظ جی کا ہوٹل" کے نام سے معروف تھا۔ یہاں ایک آنے کی روٹی اور ایک آنے کی دال کی پلیٹ مل جاتی تھی۔ حافظ جی ہمارے ہمسائے تھے اور میری مصروفیتوں سے آگاہ تھے۔ میں اکثر دیکھتا کہ اُن کی دکان پر مجھ سے چند سال بڑا

خشخشی ڈاڑھی والا ایک شخص بائیسکل پر آکر کھانا کھایا کرتا اور حافظ جی سے ڈھیروں باتیں کیا کرتا تھا۔ جب سینما کا مسئلہ ذرا تیز ہوا تو حافظ جی نے ہمیں ایک دُوسرے سے متعارف کروایا۔ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان جماعتِ اسلامی کے ترجمان روزنامہ ''تسنیم'' کے سٹاف میں شامل ہے اور اُس کا نام کوثر نیازی ہے۔ اس طرح بعد کے معروف مولانا کوثر نیازی ہماری احتجاجی مہم کا ایک رُکن بن گئے۔ گوالمنڈی کی ایک پُرانی عمارت میں اخبار کا دفتر تھا اور میں اکثر وہاں جانے لگا۔ ہم دونوں اکٹھے اپنی اپنی بائیسکلوں پر سوار مختلف اخبارات کے چکر لگایا کرتے کیونکہ اُن دنوں زیادہ مالدار لوگوں کے سوا عوام وخاص کی یہی مقبول ذاتی سواری تھی اور موٹر سائیکل تو شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے تھے۔

ہمارے نئے دوست کوثر نیازی انجمن کے ارکان کو جماعت کے مرکزی دفتر واقع ذیلدار پارک اچھرہ میں بھی لے جاتے۔ مولانا مودودی جنہیں 1953ء میں لاہور میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد فوجی عدالت نے کتابچہ ''قادیانی مسئلہ'' لکھنے کے الزام میں موت کی سزا سنائی تھی اور جسے بعد میں عمر قید میں بدل دیا گیا تھا، جیل میں تھے۔ وہاں قائم مقام امیر مولانا امین احسن اصلاحی سے ہماری ملاقات کروائی جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک ساتھی نے امیرِ جماعت سے کہا کہ ''ہماری اِس فائل میں قیامِ پاکستان سے قبل کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارے احتجاج سے متعلق تمام خط و کتابت اور اخباری سرگرمیوں کے تراشے اکٹھے کئے ہوئے ہیں۔ اِسے ہم خاص موقعوں پر ملاقات کے لئے جانے والوں کے پاس اِس امر کے ثبوت کے طور پر لے جاتے ہیں کہ ہمیں کسی سے کوئی ذاتی عناد نہیں بلکہ ہم اِس سینما کی بنیاد رکھے جانے کے وقت ہی سے اِس کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ ہم سماجی طور پر کسی مضبوط گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیں ہر دم خدشہ رہتا ہے کہ کسی وقت ہم سے یہ فائل چھین نہ لی جائے۔ اِسے آپ یہاں رکھ لیں، ہم حفاظت کے خیال سے مطمئن

ہو جائیں گے اور جب ہمیں اِس کی ضرورت ہوگی، وقتی طور پر لے جایا کریں گے"۔
اِس تجویز پر مولانا امین احسن اصلاحی ہنسے اور کہنے لگے: "آپ کی یہ فائل یہاں زیادہ غیر محفوظ ہوگی کیونکہ یہاں پولیس آئے دن چھاپے مارتی رہتی ہے اور ہمارے ریکارڈ کی بہت سی چیزیں لے جاتی ہے۔ آپ کی فائل بھی اُن کے ہتھے چڑھ جائے گی"۔

ہماری محفل میں یہ فیصلہ ہوا کہ لاہور کے تمام مسالک کے معروف علما سے سینما کے اجرا کے خلاف اک مشترکہ بیان دلوایا جائے۔ فوٹو کاپی کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ دو کاغذوں پر تحریر لکھ لی گئی۔ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں مفتی محمد حسن اور مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا ابوالحسنات سے دستخط لے لئے گئے۔ ہم چند ساتھی اپنی بائیسکلوں پر فلیٹی ہوٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ مولانا غلام محمد ترنّم خطیب جامع مسجد سول سیکرٹریٹ کو ہوٹل سے ملحق پلاٹ میں گھاس پر بیٹھے بس کا انتظار کرتے دیکھا۔ وہیں بائیسکلوں سے اُترے اور سلام وعلیک کے بعد فائل سے کاغذات نکال کر اُنہیں دستخط کرنے کی درخواست کی۔ قلم اور کاغذ ہاتھ میں لے کر ہنستے ہوئے بولے "مجھ سے کہیں ایسی ویسی تحریر پر تو دستخط نہیں کروا رہے کہ میں مصیبت میں پڑ جاؤں"؟ ہم بھی اُن کی ہنسی میں شریک ہوئے اور کہا "حضرت! ایسی کوئی بات نہیں۔ پہلے پڑھئے اور پھر دستخط کیجئے"۔ تحریر پر سرسری سی نظر ڈالی اور دستخط کر دئے۔

مولانا ابوالبرکات سے دستخط لینے کے لئے ہمارا وفد اُن کے دارالعلوم حزب الاحناف واقع دہلی دروازہ میں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ تہ خانے میں آرام فرما رہے ہیں۔ ہم اُن کے قریب اُن کے جاگنے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہمارے ایک ساتھی کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اُس نے ہمیں باہر بلا کر دبے لفظوں میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ مولانا اِس کاغذ پر دستخط نہیں کریں گے۔ وجہ معقول تھی کہ وہ اپنے مسلک کے علاوہ کسی اَور سے مل کر کسی قسم کی مشترکہ جدوجہد کرنے کے خلاف تھے۔ اِس کی سب سے بڑی مثال گزشتہ

برس بپا کی جانے والی اینٹی قادیانی تحریک تھی جس میں اُن کے برادرِ خورد مولانا ابوالحسنات خطیب مسجد وزیر خاں نے تو بھرپور حصہ لیا مگر وہ اِس میں شریک نہ ہوئے۔ہم نے سوچا کہ اُن سے دستخط کروانا ممکن تھا بشرطیکہ ہم اُن کے پاس سب سے پہلے آتے مگر اب ہمارے پاس جو کاغذات تھے اُن پر دوسرے مسالک کے علما دستخط کر چکے تھے۔ساری صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد ہم اُنہیں سوتا چھوڑ کر واپس ہو گئے۔

بعض علما سے دستخط کروانے کی ذمہ داری مجھ اکیلے کو سونپی گئی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور گرمی کا موسم۔ اِس سلسلے میں ایک روز نسبت روڈ پر واقع ایک گلی میں شیعہ عالم حافظ کفایت حسین کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ دروازے پر دستک دی۔ وہ باہر آئے تو اُنہیں معاملہ بتا کر دستخط کروالئے اور واپس ہوا۔راستے میں یاد آیا کہ دوسرے کاغذ پر دستخط نہیں کروائے۔فوری طور پر واپس ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور حافظ صاحب کا پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ بازار میں افطاری کے لئے سامان لینے گئے ہیں۔ میں دروازے کے پاس اپنی بائیسکل کھڑی کر کے اُن کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ ایک تربوز بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ میں نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں دوسرے کاغذ پر آپ کے دستخط کروانا بھول گیا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔تربوز میرے ہاتھ میں پکڑوایا اور اُس پر کاغذ رکھ کر دستخط کر دئیے۔

اِسی سلسلے میں ایک روز مولانا داؤد غزنوی کے ہاں شیش محل روڈ پر پہنچا۔ یہاں اُن کی رہائش کے علاوہ اُن کی جماعت اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا دفتر تھا اور نماز کا باجماعت اہتمام تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اُن کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ اچانک دروازہ کھلا اور مولانا بڑی تیزی سے گویا ہوئے ''کیا بات ہے''؟ میں نے عرض کیا کہ ایک سینما کے اجرا کے خلاف علما کے ایک اجتماعی بیان پر آپ سے دستخط کروانا ہیں۔فرمایا کہ پورے مسئلہ کا مطالعہ کئے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ فائل

میرے پاس موجود ہے، آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اِس میں آپ کے رسالے کے اداریے کے تراشے بھی موجود ہیں۔ فرمایا کہ افطار کا وقت قریب ہے، ایسے میں کچھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ عرض کیا کہ ابھی ابھی تو آپ کی نماز گاہ سے عصر کی اذان ہوئی ہے اور میں نے تو اپنے گھر جا کر افطاری کرنی ہے۔ فرمایا کہ میرے پاس اس وقت حکیم صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، کل کسی وقت آنا۔ یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور میں لوٹ آیا۔

دوسرے روز بھی دروازہ کھٹکھٹانے کے طویل عمل کے بعد اچانک دروازہ کھلا اور وہی سوال ہوا۔ مؤدبانہ عرض کیا کہ کل بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، حکم کے مطابق آج دستخط کروانے کے لئے آیا ہوں۔ فرمانے لگے کہ میں نے کہا تھا، صبح کے وقت آنا۔ میں نے جواب دیا کہ آپ نے کسی وقت آنے کا حکم دیا تھا۔ میری عرضداشت قبول نہ ہوئی اور میں مایوس لوٹ آیا۔ اِس کے بعد میں نے پھر وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا مگر میرے ساتھی ایک روز ہمت کر کے وفد کی صورت میں وہاں گئے اور کامیاب و کامران لوٹے۔ بہر حال یہ مشترکہ بیان جلی حروف میں اخبارات میں شائع ہوا۔

آہستہ آہستہ یہ مسئلہ بالواسطہ طور پر سیاست پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ مالکانِ سینما نے ایک گروپ تشکیل دیا جس میں میئر لاہور کارپوریشن کے انتخابات میں سرکاری حمایت یافتہ امیدوار کامیاب کو کروانے کے لئے سینما کے اجرا میں پوری حمایت کی شرط رکھی گئی۔ نواب مظفر علی قزلباش وزیرِ اعلیٰ تھے۔ اُن کی کابینہ نے اجازت دینے کا فیصلہ کر لیا مگر گورنر میاں امین الدین آڑے آرہے تھے۔ بعد میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ مرکز میں اُن کی شکایت کی گئی کہ وہ حکومت کے ہر کام میں ٹانگ اڑاتے ہیں، یہاں تک کہ صوبائی کابینہ کے متفقہ فیصلے کے باوجود ایک سینما کے اجرا کی اجازت کے معمولی مسئلے میں مزاحم ہو رہے ہیں۔ نتیجتاً اُن کی جگہ حبیب ابراہیم رحمت اللہ کو میاں امین الدین کی جگہ پنجاب کا گورنر لگا دیا گیا۔ کچھ عرصہ قبل پاکستان کے اخبارات میں نئے گورنر کا ایک ''کارنامہ'' بڑے

زور وشور سے زیر بحث رہا تھا کہ برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے اُنہوں نے لندن میں عید میلادالنبی کی جو تقریب منعقد کروائی، اُس میں رقص و سرود کی محفل جمائی گئی تھی۔ اُن کی تعیناتی ہمارے لئے اپنی ناکامی کا واضح اشارہ تھی کیونکہ اِس مزاج کے شخص سے ہمیں نیک توقعات کی کوئی امید نہ ہو سکتی تھی۔ آخر وہی ہوا کہ جس کا اندیشہ تھا۔ اُن سے بڑی آسانی کے ساتھ کابینہ کے فیصلے پر مہرِ تصدیق ثبت کروالی گئی۔

ہم اِس سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے تجویز کیا کہ اِس مسئلے پر موچی دروازہ میں ایک احتجاجی جلسۂ عام منعقد کیا جائے جس میں معروف علما کو تقریروں کی دعوت دی جائے۔ ہم نے اِس ضمن میں اپنی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ جملہ انتظامات کا وہ خود ذمہ لیتے ہیں۔ جماعت کے قائدین سے وقت لینا اُن کا مسئلہ ہے البتہ علما کو اِس میں شریک ہونے پر قائل کرنے کے لئے مشترکہ مساعی درکار ہیں۔ صدارت کے لئے اُنہوں نے مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا ابوالحسنات کا نام تجویز کیا۔ ہم نے سب سے پہلے مولانا داؤد غزنوی سے جلسے میں شامل ہونے کا وعدہ لیا۔ پھر مولانا ابوالحسنات کے ہاں اُن کی رہائش گاہ واقع اندرون اکبری دروازہ پہنچے۔ موصوف اینٹی قادیانی تحریک میں ایک عرصہ جیل میں رہنے کے بعد ایک دو ماہ قبل ہی رہا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ہماری تجویز سے اختلاف کیا اور کہا کہ اُنہیں یہ جلسۂ عام کامیاب ہونے کی کوئی اُمید دکھائی نہیں دیتی۔ وہ کہنے لگے کہ اِس صورت میں حکومت مجھے یہ جواز بنا کر پہلے ہی گرفتار کر لے گی کہ رہا ہونے کے بعد میں کوئی نیا شوشا چھوڑنے والا ہوں اور آپ کا جلسہ کرنے کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اُنہوں نے پیشکش کی کہ وہ ہم سے تعاون کے لئے ایک وفد کے رکن یا سربراہ کی حیثیت سے گورنر، وزیر اعظم یا گورنر جنرل کے پاس جانے کو تیار ہیں۔ اُنہوں نے اندر خانے کی ایک بات بتائی کہ سی آئی ڈی کی جانب سے

اُنہیں مختلف ناموں سے خطوط آتے ہیں جن میں یہ جواب مانگا جاتا ہے کہ تحریک تو کچل دی گئی، اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟ اِس کے جواب میں اگر میں یہ کہوں کہ ہم کسی مناسب وقت کا انتظار کریں گے تو قانون کی زد میں آتا ہوں اور اگر یہ لکھوں کہ ہم نے یہ مسئلہ ختم کر دیا ہے تو وہ میرا خط عوام میں لے جا کر کہیں گے کہ دیکھو، ان مولویوں نے کتنے لوگوں کو خواہ مخواہ شہید کروا دیا لہٰذا وہ کسی خط کا جواب نہیں دیتے۔ انہوں نے پیش گوئی کی کہ ہمارے جلسے میں کوئی عالم مقرر نہیں آئے گا۔ میں بولا کہ ہم ابھی مولانا داؤد غزنوی سے مل کر آرہے ہیں، انہوں نے جلسے میں آکر تقریر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ مولانا کا نام سُن کر وہ اچانک سیدھے ہو کر بولے کہ ''میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ نہیں آئیں گے، نہیں آئیں گے، نہیں آئیں گے، اور بعد میں جب آپ اُن کے پاس جا کر دریافت کریں گے کہ وعدے کے باوجود جلسے میں شریک کیوں نہیں ہوئے تو وہ کہیں گے کہ مجھے خون کی قے آرہی تھیں''۔ لفظ ''قے'' کا حرف قاف اُنہوں نے حلق پر ذرا زیادہ ہی دباؤ ڈال کر ادا کیا۔ ہم اُن کے اِس طنزیہ جملے پر خاموش ہو کر رہ گئے اور میرا ذہن گزشتہ سال کے آغاز کے اُس واقعے کی طرف منتقل ہو گیا جب اینٹی قادیانی تحریک کی مجلسِ عمل نے حکومت کو اپنے مطالبات تسلیم کر لینے کے لئے الٹی میٹم کے طور پر فروری 1953ء کے آخری ہفتے کی ایک تاریخ ڈیڈ لائن کے طور پر دی تھی جس کے جواب میں حکومت نے مجلس کے تمام ارکان کو گرفتار کر لیا تھا مگر مجلس کے صدر مولانا داؤد غزنوی متذکرہ بیماری کی بنیاد پر گرفتاری سے محفوظ رہے تھے۔ مولانا ابوالحسنات کے اِس جواز پر ہم نے تمام معاملے کو سمجھتے ہوئے جلسے کا پروگرام منسوخ کر دیا اور مایوس ہو کر تحریک ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آخر کار سینما کے افتتاح کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ علاقے میں خدا جانے کس نے مشہور کر دیا کہ ہم لوگوں نے اِس موقع پر سینما کے سامنے احتجاج کا فیصلہ کیا ہے جس

پر متعلقہ حلقوں کو تشویش ہوئی۔ پولیس کے مقامی ٹاؤٹ مجھ سے خفیہ طور پر باتوں باتوں میں مستقبل کا لائحہ عمل دریافت کرنے لگے مگر افواہ کی تصدیق نہ کر سکے۔ بہرحال سرکاری طور پر احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجھے وہ منظر نہیں بھولتا کہ افتتاح کے موقع پر سینما کے عین سامنے سڑک کے پار پرائمری سکول کے چھپر پر رائفل بردار کانسٹیبل اپنی اپنی رائفلوں کے ٹریگر پر انگلیاں رکھے ہوئے یوں مستعد لیٹے ہوئے تھے جیسے کہ دشمن پر فائر کرنے کے لئے اُس کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔

## سکول کے بعد ملازمتوں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مراحل

میں 1951ء کے میٹرک کے امتحان میں شامل ہوا۔ اُن دنوں ثانوی تعلیمی بورڈوں کا وجود نہ ہوتا تھا۔ میٹرک سے ایم۔اے تک کے تمام امتحانات پنجاب یونیورسٹی کے تحت ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے فرسٹ ڈویژن میں اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوا۔ ڈیڑھ سولڑکوں میں میری چھٹی پوزیشن تھی۔ مُجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا مگر والد صاحب کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلوانے کے اخراجات برداشت کر سکیں لہٰذا تین چار سال چھوٹی موٹی ملازمتوں میں مصروف رہا۔ اِس کے بعد ریلوے میں سرکاری ملازمت مل گئی جو گیارہ سال تک جاری رہی اور متعدد اسٹیشنوں پر فرائض انجام دیئے۔ اِس دوران میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی تمنّا دل میں ہمہ وقت موجزن رہی۔ اُن دنوں میٹرک کے بعد پرائیویٹ طور پر ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات براہِ راست نہیں دیئے جا سکتے تھے۔ اِس مقصد کے لئے پہلے مشرقی زبانوں کے امتحانات میں کامیابی کا پُل عبور کرنا پڑتا تھا۔ چھوٹے موٹے اسٹیشنوں پر تعلیمی ہدایات حاصل کرنا ممکن نہ تھا اِس لئے 1962ء میں اپنے شہر کے اسٹیشن شاہدرہ پر تبدیلی کروائی اور فارغ اوقات میں مطالعہ کا عمل شروع کیا۔ اُسی سال 'فاضل پنجابی' کا امتحان پاس کیا اور پھر ایف۔اے کے بعد 1964ء میں بی۔اے

کے امتحان میں بھی کامیاب ہوگیا۔ اِس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ''ادارہ تعلیم و تحقیق'' (انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ) کے ایم۔اے۔ ایجوکیشن کے کورس میں داخلہ مل گیا۔ پہلا سال ملازمت سے رخصت لئے رکھی۔ بال بچوں کی کفالت کی ذمہ داری کے باعث دُوسرے سال ملازمت پر واپس جانا پڑا مگر تعلیم جاری رکھی۔ وہ یوں کہ سٹاف کے تعاون سے رات کی مسلسل ڈیوٹی کروالی اور صبح کو سائیکل پر وہیں سے سیدھا یونیورسٹی پہنچ جاتا۔ اتنا عرصہ ملازمت کرنے کے باوجود میں ڈیوٹی کی نوعیت کے باعث اِس ماحول سے بیزار ہو چکا تھا لہٰذا جس دن امتحان کا نتیجہ نکلا اُسی روز میں نے بیماری کی رخصت لی اور بالآخر استعفیٰ دے دیا۔ میں نے محکمہ تعلیم میں ٹیچر کی ملازمت کے لئے درخواست دی مگر چونکہ اُس وقت قواعدِ ملازمت کے خلاف میری عمر تیس برس سے چھ ماہ زائد ہو چکی تھی اِس لئے سرکاری ملازمت حاصل نہ کر سکا لہٰذا ایک پرائیویٹ سکول کے تدریسی سٹاف میں شامل ہوگیا۔ میں اپنے فرائض پوری تندہی سے ادا کرتا رہا مگر ڈیڑھ دو سال بعد سکول مالکان کے تاجرانہ رویہ کے باعث اِس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ کچھ عرصہ دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ پھر ایک باوثوق ذریعے سے معلوم ہوا کہ میں اپنی ڈگری کی بنیاد پر برطانیہ میں تدریس کا پیشہ اختیار کر سکتا ہوں۔ میں نے درخواست دی اور 1970ء کے ابتدائی مہینوں میں مجھے برطانیہ جانے کی اجازت مل گئی۔

اُن دنوں پی۔آئی۔اے کا لندن تک کا کرایہ 1735 روپے ہوتا تھا مگر میری مالی کیفیت اِس سے بدرجہا کم تھی۔ شرم کے باعث کسی دوست یا رشتہ دار سے قرض لینا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میرے ایک کزن کویت میں مقیم تھے۔ اُنہوں نے ایک بار مجھے آفر کی تھی کہ میں تہران میں کویت کے سفارت خانے سے ویزہ حاصل کر کے وہاں پہنچوں تو وہ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا ہے کہ میں کسی سے بھی قرض لینے سے کتراتا تھا، میں نے یہ سوچا کہ اُس کے پاس کسی طرح کویت پہنچوں

اور اُس کے مراسم سے کام لے کر دو تین مہینے کویت میں کام کر کے لندن کا کرایہ بنا کر وہاں چلا جاؤں۔ میں نے گھر کی چند اشیاء بیچیں اور اہلِ خانہ کو کرائے کے مکان میں چھوڑ کر براستہ ایران اور عراق کزن کے پاس کویت جانے کے لئے برّی راستہ اختیار کیا۔ اُن دنوں ایران جانے کے لئے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کوئٹہ سے ٹرین کے ذریعے پہلے ایران کے شہر زاہدان اور پھر دو تین روز بعد دارالحکومت تہران پہنچ گیا۔ وہاں کویت کے سفارت خانے میں ویزہ کے لئے درخواست دی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اتفاق سے چند روز بعد حضرت امام حسینؓ کے چہلم کا یوم تھا اور عراق کے سفارت خانے میں اِس موقع پر کربلا جانے کے لئے ایرانی دھڑا دھڑ ویزے بنوا رہے تھے۔ وہاں پر ملازمتوں کی تلاش کے سلسلے میں گئے ہوئے پاکستانیوں کو بھی اِس موقع سے فائدہ اٹھانے کا آسان موقع مل گیا۔ میں نے بھی ویزہ بنوایا اور بسوں پر سفر کرتا ہوُا بغداد پہنچ گیا۔ وہاں کویت کے سفارت خانے میں پہنچ کر فارم بھرا جس میں کویت میں قیام کے خانے میں پندرہ روز تحریر کیا۔ ویزہ مل گیا اور میں پہلے کی مانند بسوں میں سفر کرتا ہوا کویت پہنچ گیا۔ وہاں کزن سے رابطہ کیا مگر تعاون سے محروم رہا۔ اتفاق سے چند مزید واقف کار افراد سے ملنا ہوُا جو میرے محلہ دار تھے مگر کسی نے ہاتھ نہ پکڑا۔ بالآخر ہر طرف سے مایوس ہو کر پندرھویں روز ایک کشتی میں سوار ہو کر ایران کے ساحل پر جا اُترا۔ وہاں سے جگہ جگہ بسیں پکڑ کر زاہدان پہنچا اور پھر کوئٹہ کے راستے ٹرین کے ذریعے واپس لاہور آ گیا۔ یہاں ''شرم'' کو بالائے طاق رکھ کر ایک قریبی عزیز سے قرض لیا اور بچوں کو والدین کے پاس چھوڑ کر لندن کی راہ لی۔ 11 جولائی 1970ء کو لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر تارکِ وطن کی حیثیت سے اُترا۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران میں میرے ایک ہم جماعت کے بھائی جو لندن میں رہائش رکھتے تھے اور جنہیں آگاہ کر دیا گیا تھا، وہ مجھے لینے آئے اور اپنے گھر لے گئے۔ وہاں میں ایک

کمرے میں اُن کے کرایہ دار کے طور پر مقیم ہو گیا۔

لندن روانہ ہونے سے قبل میں نے والد صاحب سے آئندہ کے پروگرام سے متعلق بات چیت کی تھی اور کہا تھا کہ میں کچھ عرصہ بعد، جب میرے پاس معقول رقم جمع ہو جائے گی تو پہلے قرض کی ادائیگی کروں گا اور پھر آپ میرے بیوی بچوں کے ویزے لگوا کر اُنہیں روانہ کر دیں۔ میں نے اُنہیں بذریعہ خط لندن پہنچ جانے کی فوری اطلاع کر دی۔ اگلے ہفتے میں نے اُنہیں جو خط لکھا اُس میں اپنے اِس ارادے سے آگاہ کیا کہ میں خود واپس آ جاؤں گا مگر بیوی بچوں کو ہرگز وہاں نہیں بلاؤں گا۔ وجہ یہ کہ میں نے ایک ہفتے ہی میں وہاں کے معاشرے کو اپنے لوگوں کی اولادوں پر جس طرح اثر انداز دیکھا، اُس سے میرے دل میں عین وہی خدشات پیدا ہوئے جنہیں میں نے چودہ سال بعد عظیم شاعر، ادیب اور کالم نگار جناب (پیرزادہ) عطاء الحق قاسمی کے پردیس کی یادوں کے طور پر روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے ایک کالم میں پڑھا:

''میں۔۔۔۔۔امریکہ چلا گیا مگر دو سال بعد ہی واپس آ گیا کہ کہیں وہاں مستقل رہنے کی صورت میں میرے کسی پوتے کا نام 'پیرزادہ پیٹر قاسمی' نہ ہو۔''

میں نے سوچا کہ اگر میں نے وہاں تدریس کا مشغلہ اختیار کیا تو محدود تنخواہ کے باعث میں جلدی واپس وطن نہ جا سکوں گا لہٰذا کسی فرم میں ملازم ہو جاؤں جہاں کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ اوورٹائم سے معقول آمدنی کما کر بچوں کے ساتھ جا ملوں۔ پس میں نے اِس سکیم پر عمل شروع کیا۔ بحیثیت تارکِ وطن میں غیر محدود عرصہ تک وہاں رہ سکتا تھا اور برطانیہ سے باہر جا کر دو سال کے اندر بغیر ویزے کے واپس ہو سکتا تھا۔ یہ قانون میرے لئے فائدہ مند تھا کیونکہ اِس طرح میں ایک خاص عرصہ یہاں رہ کر واپس بچوں کی نگرانی کے لئے لاہور آ کر دو سال کے اندر اندر سابقہ حقوق کے ساتھ واپس جا سکتا تھا۔ پس میں وہاں پر چند مہینے دِن رات محنت کر کے اتنی کمائی کر

لیتا جو وطن میں دو سال کے گھریلو اخراجات کے لئے کافی ہو۔ پیسے ختم ہو جانے کے بعد میں پھر لندن جا پہنچتا۔ اِس طرح میں چودہ مرتبہ وہاں گیا۔ ستائیس برس میں میرا لندن میں قیام کا عرصہ ساڑھے دس برس اور وطن میں ساڑھے سولہ سال رہا۔

**لندن میں تحقیق اور علمی مصروفیات**

میں پردیس میں فُرصت کے اوقات میں مطالعہ کرتا، مقامی لائبریریوں سے استفادہ کرتا اور جب بیروزگاری کے باعث کافی وقت ہوتا تو برٹش میوزیم لائبریری، انڈیا آفس لائبریری اور لندن یونیورسٹی کے ادارہ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کی لائبریری میں اپنے تالیفات کی تکمیل کے لئے ریسرچ ورک کرتا۔ ٹی۔ وی، فلموں اور کھیلوں اور سیر و تفریح کے شوق سے عاری رہا۔ ہاں، ادبی محفلوں میں اکثر شریک ہوتا۔ شہر میں جناب افتخار عارف کے اُردو مرکز کے تحت ہونے والی تقریبات میں بھی شرکت کرتا۔ عزیز دوست جناب اختر ضیائی کے حلقۂ اربابِ ادب میں سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دئے۔ برطانیہ میں شائع ہونے والے اُردو اخبارات اور رسائل کے لئے مختلف موضوعات پر کالم اور مضامین لکھتا رہا۔

ستر کے عشرے میں برطانیہ میں بے روزگاری کے اعداد و شمار بڑھنے لگے اور میں بھی اُس کی زد میں آنے لگا۔ اِن فارغ اوقات کا علمی فائدہ میں اِس طرح اُٹھاتا کہ لندن کے تاریخی علمی مراکز کا رُخ کرتا جو شہر کے مغربی علاقے میں قائم تھے جبکہ میں مشرقی لندن میں رہائش پذیر تھا۔ زمین دوز گاڑیاں اور مقامی بسیں ''لندن ٹرانسپورٹ'' کے نام سے ایک ہی محکمہ کے زیر انتظام تھیں اور اِن دونوں شعبوں کا اجتماعی ہفتہ وار ٹکٹ اُن دنوں دو تین پونڈ میں مل جاتا تھا۔ ہر وقت مہیا رہنے والی آمد و رفت کی یہ سہولت میرے لئے بہت کارآمد تھی۔ میرے ذاتی اخراجات ہمیشہ محدود رہتے تھے، اِس لئے بے روزگاری الاؤنس میں سے اِس آمد و رفت کا خرچہ

برداشت کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ اِس الاؤنس میں سے
بچت کر کے وطن میں بیوی بچوں کے اخراجات کے لئے معقول رقم بھیج دیا کرتا۔

میں نے سب سے پہلے برٹش میوزیم لائبریری کا رُخ کیا۔ داخلے کے کاؤنٹر پر
مُدعا بیان کیا۔ ایک فارم پُر کرنے کے لئے دیا گیا جس میں مطالعہ کے مقاصد دریافت
کئے گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کی شرائط کے مطابق اِس لائبریری سے صرف وہ لوگ
استفادہ کر سکتے تھے جنھیں کسی اُور جگہ مطلوبہ مواد دستیاب نہ ہوسکتا تھا۔ وجہ یہ کہ
امیدواروں کی کثرت کے باعث مستحق افراد مطالعہ سے محروم نہ رہ جائیں۔ مختلف
قومیتوں کے چند اُور لوگ بھی وہاں موجود پائے۔ جن افراد کے پاس کسی سکول،
یونیورسٹی یا کسی تحقیقی ادارہ کی طرف سے تعارفی خط ہو، اُنھیں مطالعہ کی اکثر جلد اجازت
مل جاتی تھی۔ فارم بھرا اور باری آنے پر انٹرویو ہوا۔ پاسپورٹ طلب کیا گیا جو پیش
کر دیا۔ درخواست منظور ہوگئی۔ ایک کیمرے کے سامنے بٹھا کر تصویر کھینچی گئی اور چند
منٹوں میں میری تصویر والا ایک چھوٹا سا کارڈ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے ایک خاص
عرصے تک اِس علمی خزانے سے استفادے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

سیکیورٹی کے اہل کار لائبریری میں داخل ہونے سے پہلے یہ کارڈ چیک کرتے اور
اندر جانے کی اجازت دیتے۔ مطالعہ کے بعد باہر نکلتے ہوئے اُن بیگوں کی تلاشی لی
جاتی جن میں رِیڈر اپنی نوٹ بکیں اور پنسلیں وغیرہ رکھتے تھے۔ ایک بار ایک سکھ اہل
کار نے، جو میرا واقف کار بن چکا تھا، میرے بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے مجھ سے
معذرت کی کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ میں نے اس کے جواب میں اُسے اپنے
فرائض کی انجام دہی پر شاباش دی کیونکہ میرے علم میں تھا کہ پاکستان کی بعض
لائبریریوں سے نہایت اہم نوعیت کی نایاب کتابیں محض واقفیت یا اعتبار کی آڑ اور
افسری کے لبادے میں چوری ہوچکی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے کیٹلاگ

میں آج بھی ایسی کتابوں کے کارڈ موجود ہیں جو تین چار عشروں سے غائب ہیں۔

جب میں اِس عظیم عمارت میں قائم لائبریری کے مین ہال میں داخل ہوا تو وہاں کے ماحول میں ایک انجانی سی عظمت محسوس کی اور سینکڑوں افراد کو انتہائی انہماک کے ساتھ مطالعہ میں مصروف پایا۔ اِس بلند و بالا اور طویل و عریض ہال کے وسط میں ایک گول کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد قطاروں میں طویل میزیں بنی ہوئی تھیں جن کے درمیان چند فٹ اونچی لکڑی کے تختے حائل تھے اور اِن کے دونوں اطراف سکالر اپنے اپنے مطالعے میں مصروف تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھنے والے افراد کے درمیان حائل لکڑی کی اس دیوار کا فلسفہ یہ تھا کہ کسی رِیڈر کی توجہ مقابل میں بیٹھے ہوئے افراد کی کسی بھی حرکت پر پڑے تو یہ اُس کے خیالات کو منتشر کر سکتی ہے لہٰذا وہ اِس کیفیت سے محفوظ ہو کر اپنے کام میں مگن رہیں۔ ہر سیٹ کو ایک نمبر دیا گیا تھا اور طریقِ کار یہ تھا کہ جو رِیڈر جس سیٹ پر بیٹھ جائے، اُس روز کے مطالعے کے دوران وہ اُس کا شناختی نمبر ہوتا۔ جن کتابوں کی ضرورت ہو، کیٹلاگ میں اُن کا نمبر تلاش کرے۔ پھر ایک چھوٹے سے فارم پر اُس کی تفصیلات اور اپنی سیٹ کا شناختی نمبر لکھ کر کاؤنٹر پر پڑے ایک ٹرے میں رکھ دے اور واپس اپنی سیٹ پر آ کر مطالعہ میں مصروف ہو جائے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اہل کار ایک چھوٹی سی میز نما ریڑھی پر کتابیں رکھے آتا اور بغیر کسی کو متوجہ کئے مطلوبہ کتابیں ہر اُس رِیڈر کی میز پر رکھ کر چلا جاتا جس جس نے اُن کتابوں کا آرڈر دیا ہوتا اور یہ سلسلہ سارا دن چلتا رہتا۔ اگر اُس اہل کار کی آمد پر کوئی رِیڈر کسی وجہ سے اپنی سیٹ پر موجود نہ ہوتا تو وہ واپسی پر مطلوبہ کتابیں اپنی میز پر پڑی پاتا۔ رِیڈر اپنی سیٹ سے جتنے مرضی وقت کے لئے اٹھ کر چلا جائے اُس کی پنسلیں، نوٹ بکیں اور متذکرہ کتابیں وہاں محفوظ رہتیں کیونکہ اس دوران کوئی اَور اُس کی سیٹ پر نہ بیٹھتا۔ جب دو رِیڈر کسی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے بات کرتے تو ہمیشہ کانا

پھوسی کے انداز میں۔ اِس طرح سب کا مطالعہ بہت پُرسکون انداز میں ہوتا تھا۔ انتظامیہ کی جانب سے مطالعہ کرنے والوں کے لئے قوائد مقرر ہیں جن پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔

اِن میں سے چند ایک تحریری ہدایات درجِ ذیل ہیں:

* کھانا پینا اور سگریٹ کا استعمال، حتیٰ کہ چیونگم چبانا بھی منع ہے۔

* کتابیں اور مخطوطے وغیرہ نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کئے جائیں اور اُنہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

* کھلے صفحوں پر ہاتھوں سے دباؤ نہ ڈالا جائے۔

* کھلے مخطوطات پر کتابیں، دیگر مخطوطات یا کاغذات نہ رکھے جائیں۔

* صفحات اُلٹنے کے لئے پین یا پنسل کا استعمال نہ کیا جائے۔

* کتابیں کھول کر اُنہیں دُہرا نہ کیا جائے۔

* کتاب پر کاغذ رکھ کر نہ لکھا جائے۔

* کتاب یا مخطوطے پر نہ ہی لکھائی کی جائے اور نہ کسی قسم کا نشان لگایا جائے۔

* بال پین یا سیاہی کے پین کا استعمال ممنوع ہے۔ خاص حالات میں فاؤنٹین پین کاؤنٹر پر مہیا کردہ سیاہی بھر کر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

* مطالعہ کے دوران سیاہی والا قلم استعمال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں اور صرف سکّے کی پنسل استعمال کی جا سکتی ہے۔

* مخطوطات استعمال کرنے کے دوران کسی وجہ سے نشست سے اُٹھنا پڑ جائے تو اُنہیں کھلا نہ چھوڑا جائے۔

* کیٹیلاگ یا دیگر حوالہ جاتی کتب استعمال کرنے کے بعد اُنہیں واپس اپنی اصل جگہ پر رکھا جائے۔

* ایک دُوسرے کے ساتھ کتابوں کے تبادلہ کی اجازت نہیں۔

## نقول کے حصول کی سہولتیں

* بعض خاص صورتوں میں اجازت حاصل کرنے کے بعد ٹریس کرنے کی اجازت ہے۔

* مخصوص کمروں میں ذاتی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کی اجازت حاصل کی جاسکتی ہے۔

*فوٹوسٹیٹ کی سہولت موجود ہے۔ مقررہ فارم پر متعلقہ کتابوں کی تفصیلات کا اندراج کیا جاتا ہے اور معینہ وقت کے بعد کاپیاں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ خستہ حال نسخوں کی فوٹوسٹیٹ نہیں مل سکتی البتہ اس مقصد کیلئے فوٹو کی دوسری سہولتوں سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔

* بلیک اینڈ وائٹ اور رنگین کیمرہ کی تصویریں مہیا کرنے کا انتظام موجود ہے۔

* درجِ بالا تمام سہولتیں مقررہ اخراجات کی ادائیگی پر حاصل کی جاسکتی ہیں اور اُن سے بذریعہ ڈاک بھی فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔

یہ تمام نکات اُس دَور کے ہیں جب میں وہاں پر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب جبکہ سائنس کی ترقی کے باعث بہت سی کتابوں اور مخطوطات کو کمپیوٹر پر منتقل کیا جاچکا ہے، نقول حاصل کرنا بہت آسان ہو چکا ہے۔

## ایک نایاب کتاب کی فوٹوسٹیٹ نقل حاصل کرنے کے لئے میرا ''طریقۂ واردات''

مجھے سرسیّد کے رسالہ ''اسباب سرکشی ہندوستان'' المعروف ''اسباب بغاوتِ ہند'' کی اوّل ترین اشاعت مطبوعہ 1859ء کی تلاش تھی مگر وہ مجھے پاکستان کی کسی چھوٹی بڑی لائبریری سے دستیاب نہیں ہوسکا تھا۔ بھارت کی متعدّد معروف لائبریریوں سے مراسلت کی مگر اِس کے حصول سے محروم رہا۔ لندن کی بڑی لائبریریوں میں بھی بہت ڈھونڈا۔ بالآخر میوزیم لائبریری کے انگلش سیکشن کے کیٹیلاگ میں اُس کا ذکر پالیا۔ دراصل یہ رسالہ پندرہ سولہ انگریزی رسالوں کے ساتھ مجلّد صورت میں موجود تھا حالانکہ اِسے اورینٹل سیکشن میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے یہ جلد جاری کروائی اور کاؤنٹر کلرک

سے رجوع کیا۔ وہ ایک سیاہ فام اہلکار تھا۔ میں نے اُسے متعلقہ رسالے کی فوٹو سٹیٹ نقل کروانے کی درخواست کی۔ اُس نے اِس ضخیم جلد کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اِس بُنیاد پر نقل کروانے سے معذرت کی کہ اِس سے ساری کتابوں کی جلد بندی خراب ہو کر کتابوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں نے بڑی منت سماجت کی مگر وہ نہ مانا۔ میں نے جلد کا کیٹلاگ نمبر لکھ کر محفوظ کر لیا اور اِس کام کو ایک خاص وقت کے لئے چھوڑ دیا۔ جب میں پاکستان آیا تو لائبریری انتظامیہ کو وہ کیٹلاگ نمبر لکھ کر متعلقہ رسالہ کی نقل بھجوانے کی درخواست کی اور اُنہیں اپنے لندن کے بنک اکاؤنٹ سے نقل حاصل کرنے کے چارجز ادا کرنے کا لکھ دیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے مطلوبہ نقل ڈاک کے ذریعے موصول ہو گئی۔ میں دوستوں سے اِس امر کا ذکر کرتے ہوئے اِسے اپنا طریقۂ واردات کہا کرتا ہوں۔

### برٹش میوزیم لائبریری کے اورینٹل سیکشن کے سربراہ سے ایک ناخوشگوار ملاقات

میرے مطالعہ کا اہم موضوع سر سیّد احمد خاں کی کُتب تھا۔ کیٹلاگ استعمال کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اُس میں ایسی تین چار کتابوں کو سر سیّد کی تصنیف بتایا گیا ہے جو حقیقت میں اُن کی نہیں تھیں۔ میں نے اِس غلطی کی طرف توجہ دلانے کے لئے کاؤنٹر پر متعلّقہ شعبہ کے سربراہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو مجھے بتایا گیا کہ اُن سے وقت لینا پڑے گا۔ میں متعیّنہ وقت پر اُن کے پاس حاضر ہوا اور اپنا مُدعا بیان کیا۔ موصوف بُنیادی طور پر پاکستان سے تعلّق رکھتے تھے۔ میری بات اُنہیں سخت ناگوار گزری اور فرمانے لگے: ''سر سیّد کو مرے ہوئے پون صدی گزر چکی اور جس شخص نے یہ کیٹلاگ تیار کیا اُسے بھی اِس دُنیا سے گئے ہوئے ایک مُدت ہو گئی، اِس غلطی کو دُرست کرانے سے آپ کو کیا ملے گا؟'' میں نے ایک مثال دیتے ہوئے عرض کی کہ کیٹلاگ میں موجود اِس غلطی کی وجہ سے تحقیق میں جو غلط نتائج اخذ کئے جا رہے ہیں، اُن سے بچا جا سکے گا۔ موصوف نے اِس پر خواہ مخواہ کی بحث شروع کر دی اور بالآخر نہ صرف میری درخواست کو ردّ کر دیا بلکہ

نہایت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے مجھے واپس چلے جانے کا حکم بھی صادر فرما دیا۔

## پروفیسر رالف رسل (Ralph Russel) سے ایک ملاقات

میں نے لندن یونیورسٹی کی ''سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز'' کی لائبریری سے استفادہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہاں مطالعہ کے لئے کسی ادارے یا علمی شخصیات کا ریفرنس ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اس کام کے لئے اُسی سکول کے انگریز اُستاد پروفیسر رالف رسل سے رجوع کیا۔ پروفیسر مذکور برِ صغیر کے علمی حلقوں میں بہت معروف تھے اور اُردو کے ممتاز اُستاد اور لکھاری تسلیم کئے جاتے تھے۔ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اُنہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے انگریزی میں اُن سے پوچھا کہ انگریزی میں بات کروں یا اُردو میں۔ مسکراتے ہوئے اُردو میں جواب دیا: ''جیسے آپ مناسب تصور فرمائیں''۔ میں ایک انگریز کو اِس انداز میں بولتے دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور خوش ہو کر اپنی قومی زبان اُردو کو ترجیح دی۔ اُن سے اپنا مدعا بیان کیا کہ سکول کی لائبریری میں مطالعہ کے لئے اُن کا ریفرنس درکار ہے۔ پوچھنے لگے کہ مطالعہ کس مقصد کے لئے کر رہا ہوں۔ بتایا کہ سرسیّد احمد خاں پر تحقیق کر رہا ہوں۔ اِس موضوع پر مزید گفتگو ہوئی اور اُنہوں نے متعلقہ فارم پر دستخط کر دئے۔ میں اُن کا شکریہ ادا کر کے دروازے کی طرف چلا۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ لندن کے علمی اداروں اور لائبریریوں میں جاتے ہوئے میری عادت تھی کہ میں شلوار قمیض پہن کر جاتا تھا۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو پیچھے سے پروفیسر رسل کی آواز آئی:

''میں ایک بات سے آپ سے بہت خوش ہوں''۔

میں نے رُک کر پیچھے کی طرف دیکھا اور اُن سے استفسار کیا:

''جی، فرمایئے''!

بولے: ''اِس لئے کہ آپ نے اپنا قومی لباس پہنا ہوا ہے''۔

اُن کے اِن الفاظ سے مجھے دِلی خوشی ہوئی اور بڑے احترام کے ساتھ اُن کا شکریہ ادا کر کے رُخصت ہوا۔

## پردیس کی چند یادیں

پردیس میں میرا کھانا خالص دیسی رہا۔ اگرچہ وطن میں کبھی کھانے پکانے کی زحمت نہ کی تھی مگر وہاں توے پر روٹیاں بھی خود پکاتا اور سالن بھی بڑے مزے کا بناتا۔ وہاں مسلمانوں کی دکانوں پر حلال گوشت کی فروخت کا باقاعدہ انتظام ہے۔ ریڈی میڈ چسکوں کے حلال ہونے کے معاملے میں سخت وہمی واقعہ ہؤا ہوں لہٰذا اُنہیں اُس وقت نہ کھاتا جب تک کہ اُن کے لفافوں پر چھپاہؤا نسخہ نہ پڑھ لیتا۔ جن اشیاء میں Animal Fat کی آمیزش ہوتی، اُنہیں قطعاً نہ خریدتا اور اگر غلطی سے کوئی ایسی چیز خرید لی ہوتی تو معلوم ہوجانے پر اُسے پھینک دیتا۔ ماڈرن کھانوں سے کبھی رغبت نہ ہوئی۔ ایک بار میں ایک ایسے فلیٹ میں رہائش پذیر تھا جس کی چھت کے نیچے پیزا ہٹ تھی لیکن میں نے وہاں پیزا کا دیدار کرنا بھی گوارا نہ کیا، یہاں تک کہ وطن واپس آنے کے کئی سال بعد اِس کی شکل دیکھنا نصیب ہؤا۔

پردیس میں رہائش کی یادوں میں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر چیز برطانیہ کا سوشل سیکیورٹی نظام ہے۔ تارکِ وطن افراد کو بھی وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جن سے وہاں کے باشندے مستفید ہوتے ہیں۔ بے روزگاروں کو اُس وقت تک بے روزگاری الاؤنس دیا جاتا ہے جب تک کہ اُنہیں کوئی سرکاری یا پرائیویٹ ملازمت نہیں مل جاتی۔ یہ الاؤنس اُن کی ضروریات کے مطابق ادا کیا جاتا ہے۔ بچوں کی عمروں کے مطابق رقم متعین ہوتی ہے۔ بے روزگاروں کے بچوں کو سکولوں میں مُفت دودھ مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اگر کرایہ دار ہوں تو اُنہیں رہائش کا کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔ جب میں بے روزگار ہوتا تھا تو اِسی سکیم سے مستفید ہوتا تھا۔ میں فضول خرچ نہ تھا اِس لئے وہاں کے اخراجات پورے کر کے بھی

ایک خاص رقم وطن میں بیوی بچوں کو بھیج دیتا تھا۔ ایک بار میرا لحاف پھٹ گیا۔ میں سوشل سیکیورٹی کے دفتر پہنچا اور اُنہیں تصدیق کے لئے اپنی رہائش پر آ کر لحاف دیکھنے کی پیش کش کی۔ اُنہوں نے مجھ سے فقط ایک فارم بھروایا اور اگلی صبح ہی مجھے ڈاک میں اِس ہدایت کے ساتھ 35 پونڈ کا چیک موصول ہو گیا کہ میں تین کمبل خرید لوں۔

اِسی طرح اُن کے ٹیکس نظام کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ٹیکس کی کٹوتی تنخواہ کی رقم سے ہی ہو جاتی ہے۔ مالی سال کے دوران میں ہر ایک کو اُس کی مالی ضروریات کے مطابق ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، زیادہ ادا کردہ ٹیکس واپس کر دیا جاتا ہے۔ میں جب وطن آ کر دوبارہ وہاں پہنچتا تو ٹیکس ریفنڈ کی درخواست کا فارم منگواتا جو اگلے ہی دن مجھے ڈاک کے ذریعے مل جاتا اور میں اُسے بھر کر محکمہ کو بھیج دیتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں مجھے وصولی ہو جاتی۔ جب میں آخری بار وہاں گیا تو ٹیکس آفس والوں کو اپنا سوشل سیکیورٹی نمبر لکھ کر ٹیکس ریفنڈ فارم بھیجنے کی درخواست کی۔ پانچ دن گزر گئے اور مجھے فارم موصول نہ ہوا۔ میں نے پروگرام بنایا کہ اگلے روز دفتر پہنچ کر اُن سے فارم نہ بھیجنے کی وجہ دریافت کروں۔ اگلی صبح دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے ڈاک موصول ہوئی۔ لفافہ کھولا تو اُس میں اپنے نام کا 650 پونڈ کا چیک پایا۔ دُوسرے الفاظ میں اُنہوں نے ریفنڈ کا فارم بھرے بغیر ہی میری فائل سے حساب لگا کر زائد ٹیکس کی رقم واپس کر دی۔ یہ واقعی ایک اہم واقعہ ہے۔ کیا ہمارے ہاں سرکاری دفاتر سے اِس قسم کے ''حُسنِ سلوک'' کی ہلکی سی بھی توقع کی جا سکتی ہے؟

میں 1997ء میں مستقل طور پر وطن واپس آ گیا کیونکہ اُس وقت تک میرے تمام بچوں کی جو مجھ پر ذمہ داریاں تھیں اُن سے عہدہ برآ ہو چکا تھا۔ میں خوش تھا کہ اب مستقل طور پر بال بچوں کے ساتھ زندگی بسر ہو گی۔ وطن واپس آ کر میں اپنی تالیفات کی تکمیل اور اُن کی اشاعت میں مصروف ہو گیا۔

# جناب ضیاءالدین لاہوری کا آخری یادگار انٹرویو

انٹرویو نگار: محمد کاشف رضا

محمد کاشف رضا: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

ضیاءالدین لاہوری: میں ۱۹۳۵ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔

محمد کاشف رضا: ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ضیاءالدین لاہوری: میں نے ابتدائی تعلیم اپنے رہائشی علاقہ گڑھی شاہو لاہور کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ اِس دوران میں دینی تعلیم اِسی علاقہ کی مسجد عید گاہ سے حاصل کرتا رہا جہاں اِن دنوں ادارہ جامعہ نعیمیہ قائم ہے۔

محمد کاشف رضا: کتنے برس کے تھے جب پاکستان بنا؟

ضیاءالدین لاہوری: جب پاکستان قائم ہوا، اُس وقت میری عمر بارہ برس تھی۔

محمد کاشف رضا: کیا خاندان میں بھی علمی لوگ گزرے ہیں؟

میرے والد صاحب ریلوے ورکشاپ میں مزدوری کرتے تھے۔ وہ دینی مزاج کے حامل تھے۔ مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لینا اُن کا زبردست شوق تھا لہٰذا کام پر وقفے کے دوران تبلیغ میں مصروف رہتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد علاقہ کی ایک مسجد میں امامت کرتے رہے۔

محمد کاشف رضا: تحریک پاکستان میں کوئی حصہ لیا؟

ضیاءالدین لاہوری: جی ہاں۔ اِس چھوٹی سی عمر میں بھی تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں منعقد ہونے والے متعدد جلسوں میں شرکت کرتا اور دُوسروں کے ساتھ نعرہ بازی میں شریک ہوتا۔

محمد کاشف رضا: کیا کبھی قائداعظم کو دیکھا؟

ضیاء الدین لاہوری: ایسا موقع تو نہ مل سکا البتہ ریڈیو پر اُن کی تقریریں بڑے شوق سے سُنیں، اگرچہ وہ انگریزی زبان میں ہوتی تھیں۔ہاں، ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ قیامِ پاکستان سے اگلے سال اُن کی ایک تقریر یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں منعقدہ ایک جلسۂ عام سے نشر ہوئی۔ اُنہوں نے تقریر شروع کرتے ہوئے انگریزی کے ایک دو فقرات ہی بولے تھے کہ عوام اُونچی آوازوں میں اُن سے اُردو میں اظہارِ خیال کا مطالبہ کرنے لگے۔ مجبوراً وہ اُردو میں بولنے لگے مگر ٹوٹی پھوٹی اُردو میں دو تین فقرات کے بعد ہی اِس انداز میں معذرت کر کے کہ ''ہم افسوس کرتا کہ ہم سے اُردو میں نہ بولا جاتا، اِس لئے ہم انگریزی میں بولتا'' پھر ساری تقریر انگریزی میں کی۔

محمد کاشف رضا: کالج و یونیورسٹی میں کب جانا ہوا؟

ضیاء الدین لاہوری: ۱۹۵۱ء تک باقاعدہ سکول میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے بعد کسی کالج میں اِس لئے داخل نہ ہو سکا کہ والدین غُربت کے باعث کالج کی فیسیں ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا چھوٹی موٹی ملازمتوں کا سلسلہ اختیار کیا۔ ۱۹۵۵ء میں ریلوے کی باقاعدہ ملازمت شروع کی اور لاہور سے باہر اسٹیشنوں پر تعینات رہا۔ اِس دوران دل میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی زبردست تمنّا موجزن رہی۔ اُس دَور میں میٹرک کے بعد براہِ راست پرائیویٹ امتحانات کی اجازت نہ تھی، البتہ ایک راستہ تھا کہ مشرقی علوم (پنجابی، اُردو، فارسی یا عربی) کے مروّج امتحانات (عالم اور فاضل) میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات میں شرکت کی جا سکتی تھی۔ میں جن علاقوں میں تعینات رہا، وہاں ایسے پرائیویٹ تعلیمی ادارے نہ تھے جہاں تعلیم حاصل کرتا۔ بالآخر میٹرک کرنے کے گیارہ برس بعد ۱۹۶۲ء میں لاہور کے اسٹیشن شاہدرہ میں

تبدیلی کروائی۔ پہلے فاضل پنجابی کا امتحان پاس کیا اور پھر ایف۔اے میں کامیاب ہونے کے بعد ۱۹۶۴ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ اِس کے بعد ادارہ تعلیم و تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے (سیکنڈری ایجوکشن) کے کورس میں داخلہ مل گیا اور ۱۹۶۶ء میں تعلیم مکمل کر لی۔ میں یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کے دوران رات کو اپنی نوکری پر ہوتا تھا اور دن کے وقت یونیورسٹی کلاسز میں۔

محمد کاشف رضا: برطانیہ کا سفر کیسے درپیش آیا اور کتنا عرصہ وہاں رہے؟

ضیاء الدین لاہوری: ایم۔اے (ایجوکیشن) کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ریلوے کی گیارہ سالہ ملازمت سے فوری طور پر استعفادے دیا۔ اُس وقت میری عمر ۳۱ برس ہو چکی تھی جبکہ سرکاری سکولوں میں باقاعدہ ملازمت کے لئے عمر کی حد ۳۰ برس تھی، اِس لئے ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد تعلیم کے معاملے میں مالکان کے خالص تجارتی رویّوں نے یہ ملازمت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اِس دوران معلوم ہوُا کہ میں اپنی تعلیمی استعداد اور برطانیہ کی امیگریشن پالیسی کے مطابق وہاں کے سکولوں میں تدریس اختیار کر سکتا ہوں۔ پس درخواست دی اور کوائف کی تصدیق اور انٹرویو کے بعد مجھے برطانیہ جانے اور وہاں ملازمت کرنے کی باقاعدہ اجازت مل گئی۔ میں ۱۹۷۰ء میں لندن پہنچا مگر بوجوہ تدریس کا پیشہ اختیار نہ کیا۔ اِس کے برعکس مزدوری کو ترجیح دی۔ میں چند ماہ سخت محنت کرتا اور بیوی بچوں کے لئے اِس قدر کمائی کر لیتا جو پاکستان میں سال ڈیڑھ سال کے لئے کافی ہو اور واپس اہلِ خانہ کے ساتھ آملتا۔ بالآخر ۱۹۹۷ء میں مستقل طور پر واپس آ گیا۔ میں چودہ مرتبہ برطانیہ گیا۔ ستائیس برس کے اِس عرصے میں وہاں میرا کُل قیام ساڑھے دس برس جبکہ پاکستان میں ساڑھے سولہ برس ہے۔

محمد کاشف رضا: برطانیہ میں آپ نے قانون کی بالادستی دیکھی یا شاہی خاندان کی؟

ضیاء الدین لاہوری: میں نے برطانیہ میں جس طرح قانون کی بالادستی دیکھی وہ

میرے لئے سخت حیرت کا باعث رہی۔ کسی قسم کے دفتری امور یا کسی بھی کام کے سلسلے میں میں نے اپنے یا کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھی۔

محمد کاشف رضا: آپ نے برطانیہ کی شہرت کیوں نہ لی؟

ضیاء الدین لاہوری: جب میں پہلی مرتبہ وہاں گیا تو چند دنوں کے اندر ہی اِس نتیجے پر پہنچا کہ وہاں کا ماحول ہمارے معاشرتی تقاضوں کی عین ضد ہے اِس لئے میں نے وہاں اپنے اہلِ خانہ کو بُلوانے کا ارادہ ترک کر دیا حالانکہ قانون کے مطابق میں ایسا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی جو میں ایک محدود عرصے کے لئے وہاں جاتا اور پھر اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے واپس اُن کے ساتھ آملتا۔ جب وہاں سے کمائی گئی رقم یہاں خرچ ہو جاتی تو پھر برطانیہ کا رُخ اختیار کرتا۔ بالآخر جب میں اپنے بچوں کی پرورش کی ذِمہ داریوں سے فارغ ہو گیا تو مستقل طور پر واپس آ گیا۔ جہاں تک برطانیہ کی شہریت نہ لینے کا معاملہ ہے تو جب وہاں رہنے کا قطعاً ارادہ ہی نہ تھا تو شہریت لینا بے معنی تھا۔

محمد کاشف رضا: کون کون سے اخبارات میں کالم لکھے؟

ضیاء الدین لاہوری: برطانیہ میں ''روزنامہ جنگ، لندن''، ''ہفت روزہ اخبارِ وطن، لندن'' اور ''ہفت روزہ راوی، بریڈفورڈ'' میں لکھتا رہا۔

محمد کاشف رضا: قلمی نام سے کیوں لکھتے رہے؟

ضیاء الدین لاہوری: اِس لئے کہ قلمی نام سے قلم کار کی شناخت ہوتی ہے۔

محمد کاشف رضا: شادی کب ہوئی؟

ضیاء الدین لاہوری: میری شادی ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

محمد کاشف رضا: کتنے بیٹے اور بیٹیاں ہیں؟

ضیاء الدین لاہوری: میرے چار بیٹے ہیں۔

محمد کاشف رضا: کیا شاعری بھی کرتے رہے؟

ضیاء الدین لاہوری: شغلیہ طور پر چند غزلیں اور نظمیں لکھیں۔

محمد کاشف رضا: آپ کا ایک فیچر ہے ''خدارا مجھے شاعر دوستوں سے بچاؤ'' ،کس تناظر میں تحریر کیا؟

ضیاء الدین لاہوری: مزاحیہ انداز میں لکھے گئے اِس مضمون میں لندن کے اُن افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے جو حقیقی طور پر تو شاعر نہیں ہوتے البتہ تھوڑے بہت جوڑ ملانے کی صلاحیت کے حامل ہونے کی بنا پر خود کو شاعر کہلوانے کا شوق رکھتے ہیں اور دوسروں کو اپنا بور ''کلام'' زبردستی سُنا سُنا کر اُنہیں بُری طرح پریشان کرتے ہیں۔

محمد کاشف رضا: ریلوے کی نوکری کتنا عرصہ کی اور کیوں چھوڑی؟

ضیاء الدین لاہوری: ریلوے کی نوکری گیارہ برس کی۔ جب ماسٹرز ڈگری کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا تو تدریس کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے یہ ملازمت چھوڑ دی۔

محمد کاشف رضا: سرسیّد پر تحقیق کی طرف کیسے متوجہ ہوئے؟

ضیاء الدین لاہوری: یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں نے مولانا حالی کی کتاب ''حیاتِ جاوید'' سے سرسیّد کے حقیقی افکار سے متعلق کچھ نوٹس لئے ہوئے تھے۔ ایک بار ایک استاد صاحب نے سرسیّد پر لیکچر دیا جو اِن نوٹس کے برعکس تھا۔ میں نے اُنہیں وہ تحریر دکھائی مگر وہ حقیقت تسلیم کرنے کی بجائے اپنے ارشادات کا بے تکا جواز پیش کرنے لگ پڑے۔ یہ وجہ تھی جو میں سرسیّد پر تحقیق کی طرف متوجہ ہوا۔

محمد کاشف رضا: سرسیّد پر آج تک جتنا لکھا گیا وہ یک طرفہ کیوں ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: سرسیّد پر آج تک جو کچھ لکھا گیا وہ سب یک طرفہ نہیں۔ برعکس لکھنے والے بھی بہت ہیں لیکن تعلیمی افکار اور پالیسیوں پر مسلط ایک طبقہ اِتنا طاقتور ہے کہ دوسرے اُس کے مقابلے میں ناکام ہیں۔

محمد کاشف رضا: سرسیّد پر لکھنے والوں نے کیا سرسیّد کو پوری طرح پڑھا ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: کسی نے کم پڑھا ہے اور کسی نے زیادہ۔ جنہوں نے زیادہ پڑھا ہے اُن میں سے بھی بہت سے ایسا کچھ لکھ جاتے ہیں جو اُن کے مطالعے سے متضاد ہوتا ہے۔

محمد کاشف رضا: آپ کی سرسیّد پر کل کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں؟

ضیاء الدین لاہوری: سرسیّد کے موضوع پر میری سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

محمد کاشف رضا: کیا سرسیّد کی جو شخصیت قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ ویسی ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: زیادہ تر نہیں۔

محمد کاشف رضا: ۱۸۵۷ء پر آپ کی دو کتابیں ہیں "1857ء کے چند اہم کردار" اور "بہادر شاہ ظفر کے شب و روز"، ۱۸۵۷ء پر ہی کیوں لکھا؟

ضیاء الدین لاہوری: مطالعے کے دوران ایسی معلوماتی تحریریں سامنے آئیں جو طبیعت اِس موضوع پر بھی لکھنے پر مائل ہوئی۔

محمد کاشف رضا: کیا ۱۸۵۷ء کو سمجھے بنا ہماری تاریخ مکمل نہیں ہوتی؟

ضیاء الدین لاہوری: واقعی، ایسا ہی ہے۔ اگر ہم اِسے نہ سمجھیں تو اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد کی بنیاد کو کیسے جانیں گے!

محمد کاشف رضا: علامہ فضل حق خیر آبادی کے بارے میں چند اہل قلم کہتے ہیں کہ انہوں نے فتویٰ جہاد نہیں دیا تھا، وہ فضل حق جہانپوری تھے۔ آپ نے بھی علامہ فضل حق خیر آبادی پر لکھا ہے۔ آپ کی تحقیق کیا ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: حقیقت میں کسی فتویٰ جہاد میں علامہ فضل حق خیر آبادی کا نام شامل ہونے یا نہ ہونے کا کوئی جھگڑا نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اُن کے

مسلک سے اختلاف کے باعث جنگِ آزادی میں اُن کے کردار کو منفی طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ میں نے اپنی تحقیق میں اُس دَور کے ریکارڈ کو پیش کر کے اُن لوگوں کا بطلان کیا ہے۔

محمد کاشف رضا: کیا پاکستان ۱۴ راگست کو بنا؟؟

ضیاء الدین لاہوری: میں نے تو یہ لکھا ہے کہ پاکستان ۲۷ ویں رمضان بروز جمعۃ الوداع کو قائم ہوا، البتہ اُس روز عیسوی تاریخ چودہ اگست نہیں بلکہ پندرہ اگست تھی۔ چودہ اگست کو جمعہ نہیں، جمعرات کا روز تھا۔

محمد کاشف رضا: فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ترجمہ قرآن پر آپ نے لکھا ہے۔ کیا وہ ترجمۂ قرآن آپ نے اصل مطبوعہ دیکھا ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز لندن میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مطبوعہ ترجمہ قرآن کا ابتدائی حصہ موجود ہے اور میں نے اُس سے نوٹس لئے جو میرے پاس محفوظ ہیں۔

محمد کاشف رضا: ''جوہرتقویم'' کے نام سے بھی آپ کی ایک کتاب مطبوعہ ہے۔ یہ تقویم پر لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کی اہمیت بیان فرمائیں؟

ضیاء الدین لاہوری: تقویم کے موضوع پر مجھے سکول کے ایام سے ہی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ یہ موضوع ہمارے اُس دَور کے میٹرک کے نصاب میں شامل ہوتا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور مطالعہ بڑھتا گیا۔ میں نے انگریزی اور اُردو میں دو کتابیں ہجری تاریخوں سے تقابلی عیسوی تاریخیں معلوم کرنے کی دیکھیں تو احساس ہوا کہ ایک کتاب عیسوی تاریخوں سے تقابلی ہجری تاریخیں معلوم کرنے کی بھی ہونی چاہیے۔ یہ خیال ''جوہرِ تقویم'' مرتب کرنے کی اصل بنیاد بنا۔

محمد کاشف رضا: رویت ہلال کا مسئلہ بھی آپ کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ پاکستان

میں رویت ہلال پر کیوں تنازعہ کھڑا ہوتا ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: پاکستان میں جب رویتِ ہلال کمیٹی پر چاند ہونے یا نہ ہونے کے اعلان کی ذِمہ داری عائد ہوئی، اُس وقت اِس مسئلے پر تنازعات تقریباً ختم ہو گئے مگر ایک عرصہ بعد ایک شہر کے ایک مبیّنہ عالم یا مفتی نے اپنا ڈیڑھ اینٹ کا ایک الگ ادارہ بنا لیا جو اصل یوم سے ایک روز پہلے چاند ہونے کا اعلان کر کے تفرقہ پیدا کرتا رہا حالانکہ دُنیا کے تمام ماہرینِ فلکیات کے مطابق اُس روز چاند نظر آنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کیوں کیا جاتا رہا، اللہ ہی جانتا ہے۔ اب ایک دو سال سے کچھ آرام دکھائی دیتا ہے، اللہ کرے کہ آئندہ ایسا ہی سکون قائم رہے۔

محمد کاشف رضا: اکثر ٹی وی اینکر اور اخباری کالم نگار رویت ہلال کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتے، پھر بھی اس مسئلہ میں گھس جاتے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

ضیاء الدین لاہوری: وہ لوگ شہرت کے پُجاری ہوتے ہیں جبکہ اُن کا بحث ومباحثہ اُن کی کم علمی، جہالت اور خود فریبی کا نمونہ ہوتا ہے۔

محمد کاشف رضا: ہمارا نصاب تعلیم کیا وہی ہے جو لارڈ میکالے چاہتا تھا؟

ضیاء الدین لاہوری: انگریزوں کی حکمرانی کے دوران اور اُس کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہمارا نصابِ تعلیم ایسا نہ تھا جو لارڈ میکالے چاہتا تھا۔ اب چند برسوں سے ہم اُس کی چاہت کے ضرورت سے زیادہ ہی مطیع ہو گئے ہیں۔

محمد کاشف رضا: آپ دوران تحقیق علی گڑھ یونیورسٹی گئے۔ کیا وہاں وہی لوگ فارغ التحصیل نکلے جن کا خواب سرسیّد نے دیکھا تھا؟

ضیاء الدین لاہوری: میں دورانِ تحقیق علی گڑھ یونیورسٹی نہ جا سکا۔ ہاں، قیامِ پاکستان سے قبل بچپن میں والد صاحب کے ساتھ کئی مرتبہ علی گڑھ جانا ہوا اگر اُس عمر

میں نہ اتنی تعلیم تھی اور نہ تحقیقی شعور۔

**محمد کاشف رضا:** آپ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا، وہ بہت خشک اور تھکا دینے والے ہیں، ایسا سفر کیوں اختیار کیا؟

**ضیاء الدین لاہوری:** اپنی طبیعت کا جبر اِس امر پر مجبور کرتا تھا۔

**محمد کاشف رضا:** لفاظی کے بل بوتے پر اور تعلقات کی بیساکھی سے لوگوں نے حکومت سے اپنی کتابوں پر ایوارڈ بھی لیے، آپ کو بھی کوئی ایوارڈ ملا؟

**ضیاء الدین لاہوری:** میں نے ادبی محفلوں میں نہ ہونے کے برابر شرکت کی، کسی لابی میں شریک نہیں ہوُا، نہ ایوارڈ دینے دلانے والی ہستیوں یا اِس طرح کی سفارشیں کرنے والوں سے تعلقات قائم کیے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اِن چیزوں کا شوق ہی نہیں، اپنے کاموں میں مصروف رہا اور ذاتی تشہیر سے گریز کیا۔

**محمد کاشف رضا:** کیا آپ کا گھرانہ دینی خیالات کا حامل تھا جو آپ تاریخ کے ان موضوعات کی طرف آئے جن کا کچھ نہ کچھ حصہ دینی رجحان کا پتہ دیتا ہے؟

**ضیاء الدین لاہوری:** میرے والد صاحب مذہبی امور کے شیدائی تھے۔ میرے موضوعات کا رُجحان اُن کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

**محمد کاشف رضا:** آپ فکری طور پر کن علماء کی طرف مائل ہیں؟

**ضیاء الدین لاہوری:** جو ہر امر میں دوسروں پر خواہ مخواہ کی فتویٰ بازی سے گریز کرتے ہیں۔

**محمد کاشف رضا:** کوئی خواہش جس کے پورا ہونے کی آرزو ہو؟

**ضیاء الدین لاہوری:** اللہ تعالیٰ آخری سانس تک ایمان پر قائم رکھے۔

☆☆☆

# فہرست مضامین ومقالات

اور

# تالیفات

# ضیاءالدین لاہوری

ترتیب وتدوین:

خالد اعجاز مفتی

# اشاعت ہائے تالیفات

(1) سرسیّد کی کہانی، اُن کی اپنی زبانی (مقدمہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری)
ادارہ تصنیف و تحقیق، کراچی 1982ء ص109
جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2004ء/2005ء/2010ء ص119

(2) خود نوِشت حیات سرسیّد (حرفے چند: ڈاکٹر تحسین فراقی)
جنگ پبلشرز، لاہور 1993ء ص372
فضلی سنز، کراچی 1998ء "
عاکف بک ڈپو، نئی دہلی 2005ء "
جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2005ء / 2008ء "

(3) خود نوِشت افکار سرسیّد (حرفے چند: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری)
فضلی سنز، کراچی 1998ء ص272
جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2004ء / 2010ء ص271

(4) نقش سرسیّد
(چند خیالات: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری)
دارالفکر، کراچی 1998ء ص215
دارالکتاب، لاہور 2004ء ص264
جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2006ء ص308

(5) آثارِ سرسیّد

جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2007ء ص304

(6) سرسیّد اور اُن کی تحریک (سخنے چند: پروفیسر امجد علی شاکر)

جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2007ء ص366

(7) کتابیات سرسیّد

مجلس ترقی ادب، لاہور 2008ء ص228

علم و عرفان پبلشرز، لاہور 2015ء ص204

(8) بہادر شاہ ظفر کے شب و روز

ادارہ مطبوعات، لاہور 1999ء ص216

علم و عرفان پبلشرز، لاہور 2004ء / 2009ء ص214

عاکف بک ڈپو، نئی دہلی 2014ء ص214

(9) مغلیہ دہلی کے آخری ایام

پورب اکادمی، اسلام آباد 2007ء ص239

علم و عرفان پبلشرز، لاہور 2015ء ص264

(10) 1857ء کے چند اہم کردار

علم و عرفان پبلشرز، لاہور 2007ء ص143

(11) جوہرِ تقویم (تعارف: ڈاکٹر سیّد عبداللہ)

الحقائق، لاہور 1983ء /1986ء ص118

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور 1994ء ص291

جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور 2004ء ص311

(12) مختصر سالانہ تقابلی تقویم

دارالکتاب، لاہور 2009ء ص78

**(13) Hijra & Christian Calendars**

Ilm-o-Irfan Publishers, Lahore. (2004) pp.272

(14) پاکستان پندرہ اگست کو قائم ہوا

الحقائق، لاہور ب۔ت ، 2016ء ص24

(15) رُویت ہلال موجودہ دور میں (تعارف: پیر محمد کرم شاہ الازہری)

مطبوعہ لندن 1987ء ص62

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور 1987ء ص70

# مضامین/ مقالہ جات

## سرسیّد اور علی گڑھ تحریک

(1) سرسیّد کی ایک نادر فارسی درسی کتاب

قومی زبان، کراچی اپریل 1981ء ص43 تا 45

کتاب، لاہور مارچ 1982ء ص27-28

ہماری زبان، دہلی 15 مئی 1982ء ......

(2) سرسیّد اور عُلما کے اختلاف کی بنیاد

فکر و نظر، اسلام آباد ستمبر 1981ء ص4 تا 18

الرشید، ساہیوال نومبر 1981ء ......

الفرقان، لکھنؤ جنوری 1982ء ص29 تا 40

بیّنات، کراچی فروری 1982ء ص11 تا 22

| برہان، دہلی | فروری 1982ء | ص 5 تا 19 |
|---|---|---|

**(3) سرسیّد کیمبرج یونیورسٹی میں**

| العلم، کراچی | اکتوبر تا دسمبر 1981ء | ص 11 تا 16 |
|---|---|---|

**(4) سرسیّد، میکالے اور ذریعۂ تعلیم**

| فروزاں، لاہور | اپریل تا جون 1982ء | ص 20 تا 27 |
|---|---|---|
| تعلیمات، لاہور | جولائی/اگست 1983ء | ص 21 تا 26 |
| اردو ادب، دہلی | 1982-83ء | ...... |

**(5) سرسیّد کی ابتدائی تصانیف کی ترتیب اور اشاریہ**

| العلم، کراچی | اپریل تا جون 1982ء | ص 68 تا 75 |
|---|---|---|

**(6) کانگرس کے حق میں علمائے کرام کے فتووں کا پس منظر**

| جنگ، لاہور | 14 دسمبر 1982ء | ادارتی صفحہ |
|---|---|---|

**(7) سرسیّد اور اُن کے معتقدین**

| الحق، اکوڑہ خٹک | جولائی 1984ء | ص 5 تا 14 |
|---|---|---|

**(8) سرسیّد، مرزا قادیانی اور انگریزی حکومت**

| الحق، اکوڑہ خٹک | ستمبر 1984ء | ص 13 تا 23 |
|---|---|---|

**(9) تصانیف سرسیّد دوسری زبانوں میں**

| کتاب، لاہور | اکتوبر 1984ء | ص 30 تا 32 |
|---|---|---|

**(10) علی گڑھ کالج کے اصل مقاصد ونتائج**

| الحق، اکوڑہ خٹک | جنوری 1985ء | ص 23 تا 31 |
|---|---|---|
| الفاروق، کراچی | دسمبر 1989ء | ص 23 تا 27 |

**(11) سرسیّد اور تعلیمِ نسواں**

| | | |
|---|---|---|
| الحق، اکوڑہ خٹک | جنوری 1987ء | ص 23 تا 31 |
| اردو ادب، دہلی | ...... | ...... |

**(12) سرسیّد اور سنہ ستاون**

| | | |
|---|---|---|
| حکایت، لاہور | جنوری 1988ء | ص 177 تا 187 |

**(13) سرسیّد اور دو قومی نظریہ**

| | | |
|---|---|---|
| الحق، اکوڑہ خٹک | جولائی 1988ء | ص 35 تا 42 |
| ۔ایضاً۔ | اگست 1997ء | ص 109 تا 119 |

**(14) سرسیّد اور کانگرس میں کشمکش کا پس منظر**

| | | |
|---|---|---|
| الحق، اکوڑہ خٹک | ستمبر 1989ء | ص 35 تا 47 |

**(15) سرسیّد، مشرقی علوم اور پنجاب یونیورسٹی**

| | | |
|---|---|---|
| الحق، اکوڑہ خٹک | دسمبر 1993ء | ص 20 تا 25 |
| ختمِ نبوّت، کراچی | 14 جنوری 1995ء | ص 13 تا 14 |

**(16) سرسیّد کی تعلیمی تحریک کا طبقاتی محور**

| | | |
|---|---|---|
| الحق، اکوڑہ خٹک | جنوری رفروری 1994ء | ص 53 تا 59 |

**(17) مطالعہ سرسیّد۔ تضادات کے چند اہم پہلو**

| | | |
|---|---|---|
| سیارہ، لاہور | فروری 1994ء | ص 58 تا 68 |

**(18) سرسیّد کی انگریز نواز حکمتِ عملی**

| | | |
|---|---|---|
| الحق، اکوڑہ خٹک | دسمبر 1994ء | ص 21 تا 24 |

**(19) سرسیّد احمد خاں اور سنہ ستاون**

| | | |
|---|---|---|
| جنگ، لاہور | 23 نومبر 1995ء | ادارتی صفحہ |

(20) مُلّا دوست محمد قندھاری کی سر سیّد سے مبینہ ملاقات

الحق، اکوڑہ خٹک مارچ/اپریل 1996ء ص 45 تا 51

(21) سر سیّد کے شیدائی مصنّفین میں تحریف کا شوق

نقیبِ ختمِ نبوّت، ملتان دسمبر 1997ء ص 17 تا 21

(22) سر سیّد کے عقیدت مندوں کے عجیب رویّے

ساحل، کراچی جولائی 1998ء ص 32 تا 38

(23) تذکرہ ہائے سر سیّد میں تضاد اور بددیانتی کی چند مثالیں

الحق، اکوڑہ خٹک ستمبر 2000ء ص 35 تا 48

(24) سر سیّد کا نظریۂ قومیت اور مولوی عبدالحق

الحق، اکوڑہ خٹک اکتوبر 2000ء ص 14 تا 18

(25) ولیم میور، دیانند سرسوتی اور سر سیّد

الحق، اکوڑہ خٹک دسمبر 2000ء/ جنوری 2001ء ص
51 تا 61

(26) علماءِ دیوبند اور سر سیّد احمد خاں

الشریعۃ، گوجرانوالہ جون 2002ء ص 36 تا 41

(27) سر سیّد غریب کیوں کشتنی و گردن زدنی

دن، لاہور 23-24 مئی 2002ء ......

الحق، اکوڑہ خٹک جون 2002ء ص 36 تا 39

نقیبِ ختمِ نبوت، ملتان فروری 2004ء ص 40 تا 43

(28) سر سیّد کا نظریۂ قومیت بھارتی مسلم دانشوروں کی نظر میں

القاسم، نوشہرہ اگست 2002ء ص 26 تا 28

نغمۂ توحید، گجرات مارچ/اپریل 2003ء ......

**(29) سرسیّد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی نظر میں**

الحق، اکوڑہ خٹک اکتوبر 2002ء ص45 تا 48

**(30) سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں سرسیّد کا مبینہ حصہ**

الشریعہ، گوجرانوالہ جولائی 2003ء ص35 تا 37

**(31) جنگِ آزادی کے پرستاروں پر تنقید کی مہم**

نقیبِ ختمِ نبوت، ملتان اپریل 2004ء ص44 تا 48

**(32) سرسیّد اور علامہ اقبال کے نام پر انگریزوں کی غلامی کا جواز**

دن، لاہور 26 مئی 2004ء ص11

**(33) سرسیّد کے ذکر میں حدِ ادب کی قیود**

بازیافت، لاہور (شمارہ ۴) جنوری تا جون

2004ء ص287 تا 294

**(34) سرسیّد، قائدِ اعظم اور نظریۂ قومیت**

دن، لاہور 7 جنوری 2005ء ص11

خبریں، لاہور 12 فروری 2005ء ص11

**(35) سرسیّد اور قائدِ اعظم کے نظریات قومیت میں تضاد**

پاکستان، لاہور 12 جنوری 2005ء ص12

**(36) سرسیّد کے بارے میں تاریخی افسانوں کی حقیقت**

الشریعہ گوجرانوالہ اکتوبر 2005ء ص21 تا 26

**(37) ''اسباب بغاوت ہند'' : پسِ پردہ محرکات**

جریدہ، کراچی (نمبر 36) جون 2006ء ص915 (31 صفحات)

# رُویتِ ہلال

**(1) رُویتِ ہلال اور ہجری تقویم**

| | | |
|---|---|---|
| فکرونظر، اسلام آباد | مئی 1981ء | ص 5 تا 14 |
| الاعتصام، لاہور | 26 جون 1981ء | ص 4 تا 7 |
| رضوان، لاہور | اگست رستمبر 1981ء | ص 27 تا 35 |
| نوائے وقت، لاہور | 28 جنوری 1982ء | ...... |

**(2) رُویتِ ہلال سائنسی تحقیق کی روشنی میں**

| | | |
|---|---|---|
| برہان، دہلی | اگست 1981ء | ص 31 تا 36 |
| الفرقان، لکھنؤ | اکتوبر 1981ء | ص 34 تا 39 |

**(3) عالمِ اسلام میں رُویتِ ہلال پر مکمل اتفاق کا مسئلہ**

| | | |
|---|---|---|
| الفرقان، لکھنؤ | دسمبر 1981ء | ص 34 تا 40 |
| جنگ، لاہور | 22 دسمبر 1981ء | ...... |
| جنگ، لندن | 18 جون 1982ء | ص 5 |

**(4) رُویتِ ہلال اور سعودی عرب**

| | | |
|---|---|---|
| مسلم گارڈین، مانچسٹر | نومبر ردسمبر 1982ء | ...... |
| الفرقان، لکھنؤ | جنوری 1983ء | ...... |

**(5) رُویتِ ہلال کے فلکیاتی شواہد**

| | | |
|---|---|---|
| المعارف، لاہور | اگست 1984ء | ص 41 تا 48 |

**(6) پاکستانی اور سعودی چاند**

جنگ، لاہور　19 ستمبر 1984ء　در کالم عبد القادر حسن

**(7) سعودی عرب میں رُویتِ ہلال کی کیفیت**

بیّنات، کراچی　نومبر 1984ء　ص 10 تا 19

**(8) یورپ میں رُویتِ ہلال پر اختلاف کی بنیاد**

جنگ، لندن　17 جون 1985ء　......

**(9) کیا برطانیہ میں رُویتِ ہلال پر اختلاف ختم نہیں ہوسکیں گے؟**

اخبارِ وطن، لندن　14-21 مئی 1986ء　......

**(10) رُویتِ ہلال ۔ مسئلہ اور حل**

نوائے وقت، لاہور　22 مئی 1987ء　میگزین ص 7

**(11) پاکستان میں رُویتِ ہلال پر انتشار کیوں؟**

نوائے وقت، لاہور　3 مئی 1990ء　ص 7

**(12) پروفیسر طاہر القادری کا نظریۂ رُویتِ ہلال**

الحق، اکوڑہ خٹک　اگست 1998ء　ص 31 تا 39

**(13) رُویتِ ہلال کے متعلق بعض غلط فہمیاں**

فلکیات، کراچی　اپریل 2000ء　ص 31 تا 35

**(14) سعودی عرب میں رمضان المبارک کی رُویتِ ہلال کا 42 سالہ ریکارڈ**

فقہ اسلامی، کراچی　ستمبر 2006ء　ص 34 تا 37

**(15) مرکزی رُویتِ ہلال کمیٹی کے اراکین سے چند گزارشات**

تکبیر ٹائمز، فیصل آباد　اگست 2008ء　ص 38

**(16) جناب مفتی محمد رفیع عثمانی اور جناب مفتی منیب الرحمٰن کی خدمت میں**

تکبیر ٹائمز، فیصل آباد　اگست 2009ء　ص 30

**(17) رُویت ہلال کا خود ساختہ فارمولا**

تکبیر ٹائمز، فیصل آباد　　اپریل 2010ء　　ص 22

## تقویم

**(1) تقویم ہجری وعیسوی**

قومی زبان، کراچی　　جنوری 1978ء　　ص 17 تا 19

**(2) حسابی تقویم کی بنیاد**

خُدام الدین، لاہور　　7 راگست 1981ء　　ص 11 تا 15

**(3) یوم آزادیٔ پاکستان۔ 14 یا 15 اگست؟**

جنگ، لاہور　　10 مارچ 1987ء　　ادارتی صفحہ

**(4) تقویم عہدِ نبوی پر ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کا علمی جائزہ**

اہلِ حدیث، لاہور　　25 ستمبر 1987ء　　ص 16 تا 18

(قسط دوم)　　2 راکتوبر 1987ء　　ص 11 تا 14

**(5) شمسی تاریخوں کی تعیین : ایک مغالطہ**

نعت، لاہور　　مئی 1998ء　　ص 105 تا 108

**(6) قیام پاکستان کی اصل تاریخ : 14 یا 15 راگست؟**

پروان، لاہور　　اپریل 2005ء　　ص 3 تا 15

جریدہ، کراچی (نمبر 36)　جون 2006ء　ص 806 (16 صفحات)

# متفرق

**(1) منشی رجب علی کی اسناد خیر خواہی**

حکایت، لاہور مارچ 1981ء ص65 تا 76

معارف، اعظم گڑھ اگست 1981ء ص125 تا 141

جامعہ، دہلی ستمبر 1981ء ص7 تا 23

البنوریہ، کراچی نومبر دسمبر 1993ء ص27 تا 32

**(2) فورٹ ولیم کالج کا ترجمۂ قرآنِ مجید**

المعارف، لاہور مارچ 1983ء ص17 تا 26

**(2a) نظر ثانی و اضافہ کے ساتھ**

بازیافت، لاہور جولائی تا دسمبر 2003ء ص101 تا 113

**(3) برٹش میوزیم لائبریری کے چند اہم شعبے**

کتاب، لاہور جنوری 1985ء ص25 تا 27

**(4) اذان کا شوق اور مساجد کے لاؤڈ سپیکر**

حکایت، لاہور فروری 1988ء ص257 تا 262

**(5) مفتی صدرالدین آزُردہ اور سنہ ستاون**

نقیبِ ختمِ نبوت، ملتان مارچ 1998ء ص39 تا 42

**(6) ڈاکٹر محمد فاروق دیوا کا سرقہ**

جریدہ، کراچی (نمبر 36) جون 2006ء ص782 (8 صفحات)

**(7) تحقیقی کارنامہ یا سرقے کا شاہکار؟ (بر مقالہ ڈاکٹر فوق کریمی!)**

غالب، کراچی شمارہ 23 (2015ء) ص271 تا 290

# مضامین طنز و مزاح

"اخبار وطن"، لندن

(1) اسلامی چھاپ کی خبریں 22-29 دسمبر 1982ء

(2) منصوبہ تاجے نائی کا 5-12 جنوری 1983ء

(3) کمپیوٹرائزڈ انسان کی تلاش 12-19 جنوری 1983ء

(4) خُدارا، ہمیں اِن شاعر دوستوں سے بچاؤ 29 اکتوبر۔5 نومبر 1986ء

(5) حکمرانوں کے لطیفے 24-31 دسمبر 1986ء

"راوی"، بریڈفورڈ

(6) اپنی ایک سونویں سالگرہ پر قائدِ اعظم کا پیغام 24 جنوری 1986ء

# اخباری کالم

## "کڑوے حقائق"

"جنگ"، لندن

(1) درباری بھانڈوں کے سوانگ 23 نومبر 1982ء

(2) کھری کھری 24 دسمبر 1982ء

(3) بیرونِ وطن ملکی حالات پر رائے زنی کا مسئلہ 3 جنوری 1983ء

(4) کھری کھری 15 جنوری 1983ء

(5) کھری کھری 28 جنوری 1983ء

(6) فرشتۂ اجل کے دوست 25 اکتوبر 1985ء

(7) مغرب کی فلاحی مملکتیں اور اسلام 28 اکتوبر 1985ء

(8) پاکستانی سیاستدانوں پر زمین اور فضا کے اثرات 30 اکتوبر 1985ء

(9) ڈاڑھی اور مونچھ کا مقدمہ 7 نومبر 1985ء

(10) لندن پلان 20 نومبر 1985ء

(11) پاکستانی حکمرانوں سے منسوب لطائف 23 جنوری 1986ء

## ”بخیے“

”خلیج“، لاہور (2003)

(1) کھری کھری 20 فروری

(2) نادرا کے شناختی کارڈوں پر تجدیدِ نکاح کا مسئلہ

21 فروری

(3) چھیڑ چھاڑ 22 فروری

(4) تلخ و ترش 23 فروری

(5) کڑوی کسیلی 25 فروری

(6) حاشیے 26 فروری

(7) بات میں بات 27 فروری

(8) خدالگتی 2 مارچ

(9) زخمیوں کو ہسپتال میں پہنچانے کا جرم 3 مارچ

(10) پسِ پردہ 4 مارچ

(11) چلتے چلتے 6 مارچ

(12) ” 7 مارچ

(13) بات میں بات 11مارچ

(14) " 13مارچ

(15) " 19مارچ

(16) ٹی وی چینلز پر ڈالرزدہ تجزیہ نگاروں کی بھرمار 24مارچ

# قلمی نام ضیا مفتی کے ساتھ

## "امروز"، لاہور

فیچر / کہانیاں (تراجم)

(1) کھانے پینے کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیجئے 28جنوری1968ء

(2) کبوتر نے دشمن کے حملے کی بروقت اطلاع کردی 18فروری1968ء

(3) چالاک جاسوس جس نے انگریز سراغ رسانوں کو چکرا کے رکھ دیا 17 مارچ 1968ء

(4) ذہانت کے لئے بڑا دماغ ضروری نہیں 14/اپریل1968ء

(5) مچھلی کے زہر کا کوئی تریاق نہیں 21/اپریل1968ء

(6) انسان اپنے اعصاب کی قوت سے پرواز کرسکتا ہے 7جولائی1968ء

(7) ریچھ کے پنجے میرے چہرے میں گڑ گئے 8ستمبر1968ء

پنجابی مضمون /کہانی

(1) بچپن دیاں یاداں 24ستمبر1967ء

(2) حسنا پاگل 23جون1968ء

# دیگر جرائد

### افسانہ (ترجمہ)

قاتل کی بیوی — ویمن ڈائجسٹ، لاہور — جولائی 1968ء

### آپ بیتی / کہانی

پیتل کے پنجوں والا — سیارہ ڈائجسٹ، لاہور — اپریل 1968ء

### تعلیمی مقالہ

معیارِ تعلیم گرنے کے اسباب — قندیل، لاہور — 11 اکتوبر 1967ء

### غزلیں

(1) فضائیں وفاؤں کی خاموش ہیں — فلم ڈائجسٹ، لاہور
فروری 1968ء

(2) عجب وصف خارانِ گلشن میں پایا — ......ایضاً......
اپریل 1968ء

(3) ہر بشر حُسن ووَفا کا طالب ومفتون ہے — نقاد، کراچی — جون 1968ء

# بچوں کا ادب

### کہانیاں

(1) *ڈاکٹر کا بھوت (ترجمہ) — ہمدرد نونہال، کراچی — جنوری 1968ء

| | | |
|---|---|---|
| (2) خوف کا بھوت | ......ایضاً...... | مئی 1968ء |
| (3) گہری نیند | ......ایضاً...... | ستمبر 1968ء |
| (4) دو میراثی (ترجمہ) | ......ایضاً...... | مئی 1975ء |

**فیچر (تراجم)**

| | | |
|---|---|---|
| (1) سائنسی خبریں | ہمدرد نونہال، کراچی | جولائی 1968ء |
| (2) تیرنے والی بلیاں | امروز، لاہور | 3/اپریل 1968ء |

**نظمیں**

| | | |
|---|---|---|
| (1) امتحان کا پیغام | امروز، لاہور | 6 مارچ 1968ء |
| (2) ریڈیو | ......ایضاً...... | 27 مارچ 1968ء |
| (3) وطن کا ترانہ | ہمدرد نونہال، کراچی | اپریل 1968ء |

* شامل در کہانیوں کا مجموعہ "قصہ اژدہا پکڑنے کا"
مطبوعہ ہمدرد اکیڈمی، کراچی (1977)

# گوشۂ ضیاء الدین لاہوری

جنگِ آزادی میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی شرکت

○

سرسید، مرزا قادیانی اور انگریزی حکومت

○

اذان کا شوق اور مساجد کے لاؤڈ سپیکر

# جنگِ آزادی میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی شرکت

برِ صغیر پاک و ہند میں بعض مرحوم شخصیات کی ملی و سیاسی خدمات کے تذکروں میں ہمارے اہلِ قلم بہت ہی غلو برتتے ہیں۔ اگر کوئی شخصیت شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے من کو بھا جائے تو محض اُس عقیدت کی بنا پر ہم اُس کے رتبے کو بلند و بالا کرنے کے لئے بعض واقعات گھڑ لیتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ من گھڑت واقعات تاریخی حوالوں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس اگر کسی پس منظر کے تحت ہمارے دل میں کسی شخصیت سے نفرت پیدا ہو جائے تو اُس کی تحقیر کی خاطر مستند حوالوں میں قطع و برید کر کے اُس کے مثبت کاموں کو بھی منفی قرار دے ڈالتے ہیں، اور حقیقت میں اُس سے اپنی دلی نفرت کے اظہار کے اِس انداز سے اصل مقصود محض اپنے مخاصمانہ جذبات کی تسکین ہوتا ہے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی پر ۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی میں شرکت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا جس میں انہیں کالے پانی کی سزا دی گئی اور وہ جزائر انڈیمان میں آخر دم تک اسیر رہے۔ ہمارے اہلِ قلم کا ایک مخصوص طبقہ اس جدوجہد میں اُن کے حصہ لینے سے انکاری ہے اور اُن کے مدّاحوں کے بیان کردہ بعض واقعات کو افسانے قرار دیتا ہے۔ مدّاحوں کا بیان ہے کہ انہوں نے دہلی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جبکہ اُن کے مخالف یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ایسے کسی فتوے پر اُن کے دستخط موجود نہیں۔ وہ اُن کی عدمِ شرکت کے ثبوت میں اُن کے بعض بیانات کو سیاق و سباق کے بغیر جزوی طور پر پیش کرتے ہیں یا پھر اس قسم کے شبہات پیدا کئے جاتے ہیں

جیسے کہ اُن کی شرکت گویا مفادات کے تابع تھی۔

پروفیسر افضل حق قرشی مؤخرالذکر فریق کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں اُن کے عزیز ترین دوست سعیدالرحمٰن علوی مرحوم کی مرتّب کردہ ایک کتاب ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور جہادِ آزادی'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں آٹھ مضامین اور دو ضمیمے شامل تھے جن میں پروفیسر موصوف کا ایک مقالہ بھی تھا۔ فاضل مرتّب نے اپنے دیباچے میں خاص طور پر اُن کی تعریف کی تھی۔ علوی صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۹۲ء میں انہوں نے اس کتاب میں سے چار مضامین، جن میں اپنے مضمون کا تقریباً ایک خمس، جو ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں مولانا کی عدم شرکت کے بیان تک محدود تھا، منتخب کئے اور اِس مجموعے کو نیا نام ''مولانا فضل حق خیرآبادی...... ایک تحقیقاتی مطالعہ'' دے کر اپنے نام سے شائع کرنے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ ذیل میں اُن کے مضمون کے حوالے سے چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

مولانا فضل حق کا سب سے بڑا جرم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کے بعض شیدائیوں نے، غلط یا صحیح، جہادِ آزادی کے حق میں جاری کئے گئے ایک فتوے میں اُن کے شامل ہونے کا ذکر کیا، اور چونکہ ایسا کرنے والے اپنے مؤقف کی حمایت میں کوئی دستاویزی ثبوت بہم نہ پہنچا سکے، اس لئے اُن کا ممدوح معتوب ٹھہرا اور اُس کا ہر کام اُس کے مداحین کی متذکرہ نااہلیت کے باعث منفی قرار پایا۔ اِس مکتبۂ فکر کے حامل اہلِ قلم ہر وقت اِس دُھن میں مگن رہتے ہیں کہ مولانا کی خوبیوں پر پردہ ڈالا جائے اور اختلافی امور اِس طرح بیان کئے جائیں کہ اُن کی قومی خدمات شکوک کی زد میں آکر معکوس انداز میں پیش ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کو مولانا کی زندگی کی علمی سرگرمیوں کے بعض پہلو پسند نہیں جس کا اظہار وہ متذکرہ صورت میں کرتے رہتے ہیں۔ نادم سیتاپوری اِس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''انگریز اور اُن کے ہواخواہ تو مولانا سے اس لئے ناراض تھے کہ انقلابِ سن ستاون

کے سلسلے میں کسی نہ کسی نہج سے اُن کا نام آ گیا لیکن مسلمانوں کا ایک پروپیگنڈسٹ گروپ مولانا سے اس لئے بیزار تھا کہ وہ اُن کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحثے کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا، لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔" [1]

یہ بات یقیناً درست ہے کہ جب تک ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف فتووں میں مولانا کے دستخط موجود ہونے کا ثبوت بہم نہ پہنچایا جائے، اُس وقت تک اُن کو فتویٰ کنندوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی انصاف نہیں کہ محض اِس بنا پر اُن کی جنگِ آزادی میں شرکت سے انکار کر دیا جائے۔ جہاں تک دستیاب فتووں میں اُن کا نام موجود نہ ہونے کا تعلق ہے، یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ ہندوستان کے ہزارہا علما، جن کے دستخط اِن فتووں پر نہیں، کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کے ہاں معتوب ہوں گے؟ کیا اِس بنیاد پر جنگِ آزادی میں اُن کی سرگرمیاں اور قربانیاں ملعون ٹھہریں گی؟ کیا یہ لوگ اُن علما سے بدتر ہیں جنھوں نے فتووں پر واقعی دستخط کئے مگر بعد میں مُکر گئے یا اپنی بریت کے لئے متعدد بہانے تراشے؟ یہی اہلِ قلم خود اُس دور کے اُن بے شمار علما کے قصیدے بیان کرتے ہیں جو فتویٰ کنندگان میں شامل نہیں۔ معلوم ہوا کہ موجود فتووں پر کسی عالم کے دستخط موجود ہونا ضروری طور پر اُس کے حُریت پسند ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ اُن پر اُس کا نام نہ پایا جانا کوئی جرم ہے۔ جنگِ آزادی میں اُس کے مجموعی طرزِ عمل ہی سے اُس کے کردار کی جانچ کی جا سکتی ہے۔ اُس دور میں علما کی ایک تعداد نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے حق میں فتوے دئے جس سے عام مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو تقویت حاصل ہوئی۔ بالکل درست! ہاں، اگر ایسے کسی فتوے پر کسی عالم کا دستخط کرنے سے انکار کر دینے کا کوئی قابلِ قبول ثبوت ملتا ہے تو پھر اِس امر پر بحث کی گنجائش موجود ہے مگر یہاں صرف مولانا فضل حق کے دستخطوں کی عدم دستیابی کے مسئلے نے ایک علمی جنگ کا ماحول پیدا کر رکھا ہے

اور اِس کی تائید اور تردید میں مقالوں پر مقالے لکھے گئے ہیں حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُن لوگوں کے کرتوت اجاگر کئے جاتے جو اندر سے کچھ اَور تھے اور باہر سے کچھ اَور۔ اُن کا حدود اربعہ متعین کرنے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی گئی۔

پروفیسر قریشی مولانا کے خلاف سب سے پہلی شہادت سیّد مبارک شاہ کوتوال کی دیتے ہیں کہ ''فضل حق نے جہاد کے حق میں کوئی فتویٰ نہیں دیا یا کسی بھی طریقہ سے بادشاہ کو گمراہ نہیں کیا''۔ [۲] موصوف نے اپنے مقصد کا حوالہ تو ڈھونڈ لیا مگر شاید اُن کو علم نہیں کہ وہی کوتوال مفتی صدر الدین کے بارے میں بھی یہ کہتا ہے کہ:

''شہر کے صدر الصدور مفتی صدر الدین کو شہزادوں اور فوج دونوں نے بار بار اِس امر کا فتویٰ جاری کرنے کو کہا کہ وہ جس جہاد میں مصروف ہیں، وہ جائز اور درست ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ مفتی صاحب نے ایسا کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ دراصل ایسا کوئی فتویٰ ممکن ہی نہیں کیونکہ قرآن اور مذہبِ اسلام میں اس قسم کے اعلان کا وجود کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔'' [۳]

جبکہ موصوف کی اِسی کتاب کے ایک مضمون میں شامل ایک فتوے کے دستخط کنندگان میں مفتی صاحب کا نام موجود ہے۔ امتیاز علی عرشی کے اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر اطہر عباس کی ہندی کتاب ''سوتنتر دہلی'' کے آخر میں ''بہت سے اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دئے گئے ہیں۔ ان کے منجملہ صادق الاخبار دہلی مؤرخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحے پر فتویٰ جہاد بھی موجود ہے۔'' [۴] ''اخبار الظفر'' دہلی کے حوالے سے اس کے استفتا اور جواب کی جو عبارتیں مضمون میں نقل کی گئی ہیں، اُن کے مطابق فتویٰ کنندگان میں نمبر ۳ پر مفتی صدر الدین کا نام ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ [5] واضح ہوا کہ اِس ضمن میں کوتوال کا ''فرمان'' قابلِ اعتبار نہیں، اور خاص کر اِس صورت میں کہ وہ جہاد کے فلسفے پر یقین

ہی نہیں رکھتا۔ یہاں یہ کیفیت بھی سامنے آتی ہے کہ محققین نے اُس دور میں جاری ہونے والے ایک سے زائد فتووں کا ذکر کیا ہے۔ کیا کوئی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اُس دور میں جتنے فتوے جاری ہوئے، ان سب کا ریکارڈ محفوظ ہے؟ سوچنے کا مقام ہے کہ اگر کل کلاں کوئی ایسا فتویٰ دستیاب ہو جائے جس میں مولانا کے دستخط موجود ہوں تو اِن ''محققین'' کی مبینہ تحقیق کی کیفیت کیا ہوگی؟ حیران کُن امر یہ ہے کہ اہلِ قلم کے اِس قبیلے کے ممتاز فرد غلام رسول مہر فتوے کی تیاری اور مشورے میں مولانا کا ذکر تو کرتے ہیں مگر جنگِ آزادی میں اُن کی شرکت سے انکاری ہیں۔ فرماتے ہیں:

''......میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور اُن ہی نے علما کے نام تجویز کئے جن سے دستخط لئے گئے۔ غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجامِ کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا، ورنہ اُنہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا تھا، نہ اُن کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ اُن کے خلاف کوئی اَور سنگین الزام تھا۔'' [۶]

پروفیسر قریشی بھی مولانا کی شرکت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''مولانا جنگِ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، وہ دہلی خصوصاً باغیوں سے ملنے نہیں گئے تھے''۔ [۷] اس کے بعد انہوں نے مولانا ہی کے درجِ ذیل الفاظ سے اپنا مطلب اختراع کرنے کی کوشش کی ہے:

''اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل وعیال موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح، کامیابی، کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ تو پہلے ہی مقدّر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا، اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن اُنہوں نے میرا مشورہ قبول نہ کیا اور نہ میری بات مانی''۔ [۸]

موصوف نے مولانا کی ''رائے اور مشورہ'' کو منفی ظاہر کرنے کے لئے منشی جیون لال کی ڈائری سے درجِ ذیل اقتباس دے کر بقول اُن کے یہ ''عقدہ'' کھولا ہے کہ مولانا جنگ کے حامی نہیں تھے:

''مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا، شہر کو مسمار کر دیا جائے گا اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اُسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اِس کے بعد مولوی نے کہا کہ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔'' [9]

مضمون نگار موصوف کے پیش رو غلام رسول مہر درجِ بالا الفاظ کو مولانا کی گفتگو تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کا بیان ہے کہ ''مجھے یقین ہے کہ یہاں اردو روزنامچے کے انگریزی مترجم سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ یہ رائے کسی اَور کی ہوگی جو مولانا سے منسوب کر دی گئی'' [10] مگر ہمارے مضمون نگار کی تو ساری تحقیق کی بنیاد ہی مولانا کا یہ مشورہ ہے۔ ہم اِس حوالے کی عبارت کو مولانا کی گفتگو قرار دینے سے انکار نہیں کرتے لیکن دیکھنا ہوگا کہ اِس مشورے کا پس منظر کیا تھا اور بادشاہ نے اُن کی باتوں کا کیا جواب دیا؟ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ موصوف نے جیون لال کے بیان سے درجِ بالا حوالے کے بعد کی عبارت ''لا تقربوا الصلوٰۃ'' کی مثال کی مانند حذف کر دی کیونکہ اُس سے ہی صحیح صورتِ حال کی وضاحت ہوتی تھی اور من پسند نتائج حاصل کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ افسوس ہے کہ اِس نامکمل حوالے سے متاثر ہو کر بعض دیانت دار محقق بھی اُنہی کی رو میں بہہ گئے اور اِس جدوجہد میں مولانا کی شرکت کو منفی انداز میں قبول کیا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل جیون لال کا پورا بیان پڑھ لیا جائے۔ وہ لکھتا ہے:

''مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا، شہر کو مسمار کر دیا جائے گا اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اُسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اِس کے بعد مولوی نے کہا کہ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اپنی افواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔ مولوی نے جواباً کہا کہ افسوس تو اِسی بات کا ہے کہ سپاہی اُن کا کہنا نہیں مانتے جو اُن کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اچھا، تو اپنی فوج کو محاصل جمع کرنے کے کام پر لگا دو''۔ [11]

اِس تمام گفتگو سے معلوم ہوا کہ مولانا بادشاہ کو وقت کے اہم ترین مسئلے کا احساس دلا رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر اسے حل نہ کیا گیا تو فتح ناممکن ہے اور شہر کے باشندے خواہ مخواہ قتلِ عام کی زد میں آئیں گے۔ اس وقت شہر میں مالی بد نظمی کا جو عالم تھا، جیون لال کے روزنامچے کی لمحہ بہ لمحہ داستان میں اس کی بڑی تفصیل موجود ہے۔ سپاہیوں کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لئے خوراک موجود نہ تھی اور نہ اپنے خاندان کی کفالت کے لئے کوئی رقم۔ وہ آئے دن بادشاہ سے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ بادشاہ اُن کا مطالبہ کیسے پورا کرتا جبکہ اُس کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا۔ وہ تو خود انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور ان حالات میں اسے وہ رقم ملنی بھی بند ہو چکی تھی لہٰذا سپاہی روزمرّہ ضروریات پورا کرنے کے لئے شہر میں لوٹ مار کرتے تھے اور مالدار افراد سے بزورِ بازو روپیہ وصول کیا جاتا تھا جس کی پکار دربار میں بھی ہوتی تھی۔ متذکرہ بالا گفتگو ۱۸ راگست کو ہوئی۔ صرف اس وقت تک کے بے شمار واقعات میں سے چند ایک کا ہلکا سا خاکہ پیشِ خدمت ہے:

☆ ''(۱۴ مئی) دیسی افسروں نے پھر فوجوں کے راشن کے لئے مطالبہ کیا اور کہا

کہ فوجوں کو لوٹ مار سے نہیں روکا جا سکتا۔“ [۱۲]

☆”(۱۵ مئی) خبر ملی کہ باغی شہر کے باشندوں سے بہ جبر روپیہ وصول کر رہے ہیں۔“ [۱۳]

☆”(۲۱ مئی) آج قلعہ سپاہیوں سے بھر گیا جو اپنی تنخواہ کے لئے چلّا رہے تھے۔“ [۱۴]

☆”(۲ جولائی) جنرل نے منادی کرادی کہ...... جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے گا، اس کے ہتھیار اُس سے چھین لئے جائیں گے۔“ [۱۵]

☆”(۷ راگست) سفر مینا کے ایک صوبیدار نے ...... متنبہ کیا کہ اگر فوج کو فی الفور تنخواہ نہ دی گئی تو وہ شہر میں لوٹ مار شروع کر دے گی۔“ [۱۶]

☆”(۷ ارا گست) نصیر آباد کے توپچیوں نے بغیر تنخواہ کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ [۱۷]

حالات میں سپاہیوں کی ایک بھاری تعداد مجبوراً روز بروز اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھی۔ صرف تین رپورٹیں ملاحظہ فرمائیں:

☆”(۳۱ مئی) ...... تقریباً ایک ہزار سپاہی اپنی وردیاں پھینک کر فقیروں کے بھیس میں اپنے اپنے گھر چل دئے ہیں۔“ [۱۸]

☆”(۱۵ راگست) آج تین سو سپاہی تنخواہ کے ملنے سے مایوس ہو کر اور بغاوت کے نتائج سے دل برداشتہ ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ہتھیار اور بندوقیں پیش کر دیں اور کلکتہ دروازہ سے گزر کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔“ [۱۹]

☆”(۱۶ راگست) کل تقریباً دو سو سپاہیوں نے فقیروں کا بھیس بدل کر بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر یہ لوگ پل پر پکڑے گئے اور اُنہیں واپس لایا گیا۔ بادشاہ سلامت نے بذاتِ خود اُن کے بیان لئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک تو اُن کے پاس کوئی رقم نہیں،

دوسرے اُن کے گھر تباہ ہو رہے تھے اس لئے اُنہوں نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اُن سے ہتھیار لے لئے گئے اور انہیں گھروں کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔'' [۲۰]

غور کا مقام ہے کہ کیا اِن حالات میں انگریزوں پر فتح کی کوئی امید کی جا سکتی تھی؟ مولانا کی جو نامکمل گفتگو فاضل مضمون نگار نے پیش کی، وہ اِسی پس منظر کے تحت تھی اور وہ بادشاہ کو اِس صورتِ حال کے متوقع نتائج سے آگاہ کر کے اُسے بالواسطہ طور پر یہ احساس دلا رہے تھے کہ سپاہیوں کی تنخواہوں کے لئے کچھ کیا جائے تا کہ وہ خوراک وغیرہ کے مسائل سے نجات پا کر دل جمعی کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہوں اور انگریزوں پر غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ویسے بھی جب اِس جدوجہد کے سلسلے میں جہاد کا فتویٰ دینے کے اقدام کی تحسین کی جائے گی تو اُس کا صاف صاف مطلب یہ ہوگا کہ یہ کیفیت دینی حیثیت کی حامل ہے، اور دین میں جہاد کیلئے سب سے بڑی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ مقابل پر فتح کا قیاس غالب ہو۔ بہر حال مولانا اور بادشاہ کی اِس گفتگو کا جو ردِ عمل ہوا، اُس کی وضاحت مکند لال کی اُسی روز یعنی ۱۸ راگست کی رپورٹ سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''جب بادشاہ دربار کرنے کے بعد اپنے کمرۂ خاص میں تشریف لے گئے تو مولوی فضل الحق، نواب احمد علی خاں بہادر، بُدھا صاحب اور مرزا خیر سلطان بہادر نے تحریری احکام دیے جو مفصلہ ذیل ہیں:......'' [۲۱]

ان میں نمبر ۱۶، نمبر ۱۷، نمبر ۱۸ و نمبر ۲۶ کے تحت مولانا کے حوالے سے چار احکام کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

''بنام حسن بخش عرض بیگی، ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مولوی فضل الحق کی موجودگی میں لکھا گیا......''

''بنام فیض محمد، اسے ضلع بلند شہر و علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ حسبِ ہدایت مولوی فضل الحق تحریر کیا گیا۔''

"بنام ولی داد خاں، مذکورہ دونوں آدمیوں کی آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے تحریر کیا گیا۔ مولوی فضل الحق" ..........

"بنام مولوی عبدالحق خاں، ضلع گوڑ گانوہ کی مالگزاری آمدنی وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔ حسبِ ہدایت مولوی فضل الحق لکھا گیا جن کا بھتیجا گوڑ گانوہ جائے گا۔" [۲۲]

معلوم ہوا کہ بادشاہ سے مولانا کی جو گفتگو ہوئی، اُس کے مطابق اُنہوں نے محصول اکٹھا کرنے کا کام شروع کر دیا اور اِس میں شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سب کچھ اُن سپاہیوں کی تنخواہوں کا انتظام کرنے کے لئے کیا گیا جو انگریزوں سے لڑ رہے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشتیں درجِ والا واقعہ کو یوں بیان کرتی ہیں:

"دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ اُنہوں نے بادشاہ سے کہا: "اب وقت کا تقاضا ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے تاکہ اُنہیں کچھ سہارا ہو"۔ بادشاہ نے کہا: "رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا، تو وہ پہنچی تھی مگر ناکافی تھی اور اس کی وجہ اِن باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے"۔ مولوی صاحب نے کہا: "حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دُور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجئے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کرنے دیجئے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے"۔ بادشاہ نے جواب دیا: "آپ تو یہیں ہیں، آپ انتظام سنبھالئے"۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: "میرے بھتیجے اور دوسروں کو گوڑ گانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانہ تقرر جاری کیا جائے، وہ سب انتظام کر لیں گے اور الور، جھجر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی پروانے جاری کیجئے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آ جائے گا"..... مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے، بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم

میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور اُن کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں، فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو صرف خاندانِ تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔''[۲۳]

پروفیسر قریشی نے مولانا فضل حق کی دہلی میں آمد کے بیان میں اُن کے الفاظ ''فلاح، کامیابی، کشائش و شادمانی کی امید'' کو خاص رنگ دینے کے لئے بطورِ حوالہ عبداللطیف کے ۱۸۵۷ء کے روزنامچے کی ایک عبارت کا درجِ ذیل حصہ پیش کیا ہے:

''جب زمانہ میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیر آبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے۔ نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا۔ وہ حصولِ عہدہ کے خواہش مند تھے۔''[۲۴]

اس عبارت پر کوئی تبصرہ کرنے سے قبل یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ درجِ بالا حوالہ پیش کرتے ہوئے مضمون نگار موصوف اپنے خاص وصف کا استعمال کرتے ہوئے متعلقہ حوالے کا اہم حصہ چھوڑ گئے جس سے اصل صورتِ حال مجروح ہوئی۔ پہلے پوری عبارت ملاحظہ فرمائیے:

''جب زمانہ میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیر آبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے۔ نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا۔ وہ حصولِ عہدہ کے خواہش مند تھے۔ جب کامیابی کے اشتیاق نے اُنہیں بے صبر کر دیا تو بادشاہ نے فرمایا کہ جب تک تمہاری مراد کی خوشخبری ظہور میں آئے اور کشتیٔ آرزو ساحلِ مقصود تک پہنچے، صبر کرو۔''[۲۵]

آخری فقرہ، جو خاص مصلحت کے تحت آنکھوں سے اوجھل رکھا گیا، رواں جدوجہد کی کامیابی کے بارے میں مولانا کی اُس آرزو کو بیان کر رہا ہے جس کی تردید کے لئے تحقیق کے نام پر اِس قدر تردّد کیا گیا۔ دُوسری بات یہ کہ یہ ایک ڈائری نویس کا اپنا تجزیہ ہے کہ وہ

کسی کی نیت کو اپنے الفاظ میں کس طرح بیان کرتا ہے۔ ایسے حالات میں یہ مدِ نظر رکھا جانا ضروری ہوتا ہے کہ بیان کنندہ کس حد تک قابلِ اعتبار ہے اور کیا اُس کے بیان میں تعصب کا عنصر تو شامل نہیں۔ اِس مقصد کے لئے اُس کی ایک نہایت اہم عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''جب اُن کا نصیب خراب ہوا اور منحوس ستارے کی نظر اُن کو لگی تو یکا یک میرٹھ کی زمینِ شوروشر سے (جو دہلی سے تیس کروہ کے فاصلہ پر ہے) ایک تیز آندھی چلی اور اُس سے فتنہ و آشوب کا ایک غبار اُٹھا اور چشمِ زدن میں دُنیا اور دُنیا والوں کو تہ و بالا کر ڈالا۔ عجیب غبار تھا کہ سرکار انگریزی کی ہندوستانی فوج کا کوئی آدمی ایسا نہ رہا جس نے ہندوستان کی زمین تاریک پر بغاوت کا ارادہ نہ کیا ہو، اور نئے انداز کی ایسی ہوا چلی کہ حکومت انگلشیہ کے لشکر کا کوئی متنفس زیرِ آسماں ایسا نہ تھا جو مخالفت پر آمادہ نہ ہو گیا ہو۔ اوّلاً اُس کی سپاہ، جو میرٹھ میں مقیم تھی، کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب نے کارتوس کے بہانے سے اپنے ولی نعمت کے احسان کو فراموش کر دیا اور نمک حرامی پر کمر باندھی اور مصمم ارادہ کر کے ظلم و تعدی کا ہاتھ آستین سے باہر نکالا اور قتل و غارتگری کے لئے تیار ہو گئے۔ اور حُکامِ فوج کو ہلاک کیا، اور اُن کے اہل و عیال کو بھی، جہاں تک بس چلا، زندہ نہ چھوڑا۔ دو دِن تک ''دُوسروں'' کو برباد کرتے رہے، گھروں میں آگ لگائی اور خبر رسانی کا راستہ بند کر دیا۔ بعدہٗ دہلی کا عزم کیا۔'' [۲۶]

درجِ بالا عبارت ڈائری نویس کے انتہائی متعصب ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اُس کے لئے تو ہر شخص، جو انگریز سے برسرِ پیکار تھا، ہوس پرست ہی ہو سکتا تھا۔ مولانا کے متعلق اُس کے تاثّرات اِسی تعصّب کے زیرِ اثر تھے۔

عبداللطیف کے متعلق واضح نہیں کہ اُس نے یہ ڈائری کس حیثیت سے لکھی۔ کیا اُس کے روابط دربار تک براہِ راست تھے؟ ایسا کوئی ثبوت ابھی تک سامنے نہیں آ سکا۔ اُس کی ڈائری کے مترجم خلیق احمد نظامی کے بقول اُس نے یہ روزنامچہ اپنے والد کی فرمائش پر

اُس وقت ترتیب دیا تھا جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔[۲۷] شاید وہ اِس دوران وقتاً فوقتاً سُنی سنائی باتوں کا بے ترتیب ریکارڈ رکھتا رہا جنھیں بعد میں روزنامچہ کے طور پر درج کرتے ہوئے اُن میں اپنے تاثرات بھی شامل کر دیے۔ اُس کی یادداشتوں کی بے ترتیبی کی ایک مثال یہ ہے کہ اُس نے مولانا کی دربار میں حاضری کے وقت اُن کی جس نذر و نیاز کا ذکر ۲۹ راگست کے تحت کیا ہے، وہ جیون لال کے مطابق ۲۶ راگست کا واقعہ ہے۔ واضح ہو کہ جیون لال دربار میں مستقل ڈائری نویس تھا۔ ہمارے فاضل مضمون نگار نے جیون لال کے حوالے سے انگریزوں کے ساتھ صلح کے ضمن میں مولانا کی جو گفتگو بیان کی ہے، وہ بھی ۲۹ راگست سے ایک دن پہلے یعنی ۲۸ راگست کو ہوئی تھی۔
باقی رہی عبداللطیف کے اِس تجزیے کی بات کہ مولانا کو "حصولِ عہدہ" کی خواہش تھی تو اِس کا بھی ایک پس منظر ہے۔ آپ حکومت کی کسی شعبے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال چاہتے ہیں تو آپ کے پاس کوئی عہدہ ہونا چاہیے۔ نظم و نسق کے اصولوں کے تحت اِس کے بغیر کوئی آپ کے احکام ماننے یا آپ کی حکمتِ عملی اختیار کرنے کا پابند نہیں ہوسکتا۔ مولانا کو تختۂ مشق بنانے میں اہلِ قلم کا جو طبقہ پیش پیش ہے، اُس کے فلسفے کے مطابق تو مسلمہ مجاہدین کو بھی ہوس پرست ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ اگر اِس کیفیت کو دیانت کا معیار ٹھہرالیا جائے تو جنگِ آزادی کے سب سے بڑے جرنیل بخت خاں کی درجِ ذیل آرزوئیں کس کھاتے میں شمار کی جائیں گی:

"(۲ جولائی) بادشاہ نے جنرل (بخت خاں) کو نج میں باریابی دی۔ جنرل نے کہا کہ میں بھی آپ ہی کے خانوادہ سے ہوں اور بادشاہ سے کہا کہ اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے آپ تحقیقات فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ اِس وقت جنرل سے اَور کوئی بڑا آدمی موجود نہیں ہے۔ جنرل نے جواب میں عرض کیا کہ میں بہادر کے خطاب کا حقدار ہو جاؤں گا اگر میں

دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔" ۲۸ ؎

"(۱۱ جولائی) ...... بخت خاں نے (بادشاہ سے) اثنائے گفتگو میں ظاہر کیا کہ میں ضلع لکھنؤ کے موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور شاہِ اودھ کے خاندان سے ہوں۔ اور عرض کیا گیا کہ اگر آپ کو میرے بیان میں کچھ شبہ ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ مجھے آپ کی شرافت ونجابت پر پورا یقین ہے۔ جنرل نے جواب دیا کہ میں تصدیق پر اِس غرض سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریز دہلی، میرٹھ، آگرہ سے نکال دئے جائیں گے تو میں حُسنِ خدمات کے معاوضہ کا طالب ہوں گا۔" ۲۹ ؎

"(۲۶ جولائی) جنرل محمد بخت خاں کی درخواست پر اُنہیں گورنر کے درجہ پر فائز کیا گیا۔ بادشاہ نے جنرل کے طرزِ عمل پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ جنرل نے بھی اپنی عزت افزائی پر شکریہ ادا کیا اور دس اشرفیاں بطورِ نذر پیش کیں اور وعدہ کیا کہ میں جواں بخت کی ولی عہدی کی تائید کروں گا۔" ۳۰ ؎

جنگِ آزادی میں مولانا فضل حق کی شرکت انگریزوں کے جاسوس تراب علی کی رپورٹوں کے الفاظ میں یوں واضح ہوتی ہے:

"(۲۴۔۲۵ راگست) الور کے مولوی فضل حق پچھلے ہفتے سے یہاں ہیں اور انگریزی حکومت کی شدت سے مخالفت اور دوسری ترکیبوں سے کونسل کے رکن بننے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اُن کا لڑکا سہارن پور کا ناظم مقرر ہوا ہے۔" ۳۱ ؎

"(۲۸ راگست) مولوی فضل حق جب سے دہلی سے آیا ہے، شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ اُس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔ آنے والی

نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا، شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا...... مولوی فضل حق کے کہنے پر شہزادے اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً سبزی منڈی کے پُل پر لڑتے ہیں۔" ۳۲؎

"(۳۰/اگست) ......اگر آپ مرزا الٰہی بخش کو اُس کے خط کا جواب دے دیں تو اِس مقصد کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گا اور مولوی فضل حق اور دوسرے باغیوں کو شہر سے باہر نکال دے گا۔" ۳۳؎

"(یکم ستمبر) (جنگی مشاورتی) کونسل میں دہلی کی ہر رجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی اور مولوی فضل حق بھی شامل ہیں۔" ۳۴؎

باقی رہی بات مولانا پر مقدمے کی مثل کی جس کے کچھ حصے فاضل مضمون نگار کی کتاب میں شامل مالک رام کے مضمون میں بیان کئے گئے ہیں، اُن میں نقل فیصلہ کے تحت مولانا کے متعلق درجِ ذیل عبارت قابلِ غور ہے:

"عدالت کی نظر میں یہ ثابت ہے کہ اِس موقع پر ملزم نے بلاضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اُس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور اُن کے من مانے معنی کئے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لئے شریعت کے نزدیک اُن کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ اگر تم اُنہیں قتل نہیں کرتے تو خود خدا کی نظر میں مجرم ہو۔"......

"یہ بات بھی قطعی شہادتوں سے ثابت ہوگئی ہے کہ ملزم سردار ممو خاں کا خاص معتمد علیہ تھا اور وہ اکثر اُن سے مشورہ کرتا رہتا تھا جیسا کہ اُس موقع پر بھی ہوا جب اس نے قتل کا فتویٰ دیا۔"

"یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن ...... اِس نے بہیمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور اُن کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین

آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لئے انصاف اور امنِ عامہ کا یہ تقاضا ہے کہ اِسے ملک بدر کر دیا جائے۔''......

''بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اِس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اِسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔'' ۳۵ے

دستاویزات پیش کرنے کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ عدالتی فیصلے میں شہادتوں سے مولانا کے فتوے اور ''باغیوں سے رشتہ جوڑنے'' کے ثابت ہونے کے ذکر کے باوجود پروفیسر قریشی کی مانند حضرت مالک رام بھی اپنے مضمون میں یہ فرماتے ہیں کہ

''پورے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اُنہوں نے اِس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو...... لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلک رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے؛ اُنہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار ہی اٹھائی۔'' ۳۶ے

مولانا کے مخالف اہلِ قلم اپنی تحقیق کے نتائج اُن کے عدالتی بیان کی بنیاد پر نکالتے ہیں۔ دراصل مولانا اپنے اس بیان میں بغاوت میں ملوث ہونے سے انکاری ہیں جبکہ شواہد اُن کے بیان کی تردید کرتے ہیں۔ برِصغیر کے انگریزی عدالتی نظام میں اِس قسم کی بہت سی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں جن میں بڑے بڑے نام ملتے ہیں۔ ہم بہادر شاہ کے مقدمے کی کارروائی پڑھتے ہیں تو وہاں بھی اِسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ بہادر شاہ کے بیان کے اُس حصے کی ایک ہلکی سی جھلک پیشِ خدمت ہے جس میں اُس نے بغاوت کا سارا نزلہ باغی فوج پر ڈال دیا ہے:

''باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا جہاں تمام معاملات طے ہوتے تھے اور جن

معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا، انہیں یہ کونسل اختیار کرتی تھی لیکن میں نے کبھی اُن کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ اُنہوں نے اس طرح بدوں میری مرضی یا خلافِ حکم صرف میرے ملازموں ہی کو نہیں لوٹا بلکہ کئی محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا، قتل کرنا، قید کرنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جو جی چاہتا تھا، کر گزرتے تھے۔ جبراً معزز اہلِ شہر سے اور تجّار سے جتنی رقم چاہتے، وصول کرتے تھے اور یہ مطالبات اپنے ذاتی اغراض کے لئے کرتے تھے۔ جو کچھ گزرا ہے، وہ سب مفسدہ پرداز فوج کا کیا دھرا ہے۔ میں اُن کے قابو میں تھا اور کر کیا سکتا تھا؟ وہ اچانک آپڑے اور مجھے قیدی بنالیا۔ میں لاچار تھا اور دہشت زدہ۔ جو اُنہوں نے کہا، میں نے کیا وگرنہ اُنہوں نے مجھے کبھی کا قتل کر ڈالا ہوتا۔" ۳۷

"مذکورہ بالا جواب میرا خود تحریر کردہ ہے اور بلا مبالغہ ہے، حق سے اصلاً انحراف نہیں کیا ہے۔ خدا میرا عالم وشاہد ہے کہ جو کچھ بالکل صحیح تھا، جو کچھ مجھے یاد تھا، وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں مَیں نے آپ سے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر ملاوٹ کے وہی لکھوں گا جو حق اور راست ہوگا، چنانچہ ایسا ہی میں نے کیا ہے۔" ۳۸

جب ہم برِصغیر کی آزادی اور سیاسی جدوجہد کی مجموعی صورتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں تو اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسے بیانات یہاں انگریزی عدالتی نظام کی بعض شقوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے دئے جاتے رہے ہیں۔ ایسا کرنا اصولی طور پر غلط ہے یا صحیح، اور کیا ایسا کرنے والے اپنی قربانیوں کی خود ہی توہین نہیں کرتے؟ اِس سوال پر دو رائیں ہوسکتی ہیں، لیکن حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ اُنہوں نے جدوجہد میں حصہ لیا۔ یہاں مولانا فضل حق کے معاملے میں اگر کوئی اِس بات پر مُصر ہے کہ اُنہوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا تو اس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اُنہیں سزا کس جرم میں ملی؟ پروفیسر قریشی اِس کا جواب یوں دیتے ہیں:

"صرف ایک چیز جس نے انہیں جنگِ آزادی کا ہیرو بنادیا، اُن کی سزائے عمر قید

تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُن دنوں بہت سے بے گناہ اور وفادار شہریوں کو فوجی عدالتوں کی طرف سے یا تو گولی مار دینے یا شدید جسمانی اذیتوں کی سزائیں دی گئیں۔ اِس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ صہبائی دہلی کالج کے استاد تھے اور مولوی محمد باقر دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر سے نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن دونوں کو محض اِس وجہ سے گولی ماردی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں چھپے ہوئے انگریز پناہ گزینوں کی جانیں نہ بچا سکے تھے۔" ۳۹ے

پروفیسر موصوف نے اس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی جو مثال دی ہے، وہ مولانا فضل حق کے حالات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی۔ دونوں صورتوں کا موازنہ کرنے کیلئے پہلے امام بخش صہبائی کا قصہ اُن کے حقیقی بھانجے مولانا میر قادر علی کی زبانی سنئے:

"میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دَن دَن کرتے آپہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دِلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں دے دی تھیں، اس لئے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ "موت تمہارے سر پر ہے، گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں، وہ دریا میں کود پڑیں"۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے، اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ اُن کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا، اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر کر مر گئے۔" ۴۰ے

اب مولوی محمد باقر پر کیا گزری، ملاحظہ فرمایئے:

''......اُنہوں نے اپنے انگریز دوست مسٹر ٹیلر کو، جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے اور زبردست عیسائی مبلغ تھے، باغیوں کے غیظ وغضب سے بچانے کے لئے پہلے اپنے گھر میں پناہ دی، پھر اُن کو بھیس بدل کر باہر بھجوادیا لیکن باغیوں کی فہرست مجرمین سے اُن کا خارج ہونا ممکن نہیں تھا۔ ٹیلر نے باغیوں کے مزاج کا ادراک کرنے کے بجائے اپنے پناہ دینے والے محسن سے باغیوں کے عتاب کا بدلہ لیا۔ اُنہوں نے جاتے جاتے مولوی صاحب کو کچھ کاغذات سونپے اور کہا کہ یہ کسی بھی مل جانے والے انگریز کو دے دیں۔ اُن کاغذات میں ایک خفیہ کوڈ میں اُنہیں ختم کرنے کے لئے کہا گیا تھا، چنانچہ کاغذات پانے والے انگریز نے انہیں فوراً گولی سے ماردیا۔ [۴۱]''

اگرچہ یہ واقعات مختلف کتابوں میں ذرا ذرا اختلاف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن اُن سے نتائج پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ درجِ بالا واقعات کے بیان میں پروفیسر قریشی کے ارشاد کے برعکس کہ ''دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا''، باغیوں کی فہرست میں اُن کے نام پائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ اِس موقع پر ہمیں اِس سے بحث نہیں کیونکہ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے البتہ دونوں واقعات میں یہ بات مشترک ہے کہ اُن کی اموات ہنگامی طور پر یا فوری سزا کے تحت ہوئیں جبکہ مولانا فضل حق پر باقاعدہ مقدمہ قائم ہوا جس میں انگریزی عدالتی نظام کے لوازمات اپنائے گئے، استغاثہ نے اُن کے خلاف گواہ پیش کئے، جرح ہوئی جس کی روئداد پروفیسر قریشی کی کتاب میں شامل مالک رام کے مضمون میں موجود ہے جو مضمون نگار نے براہِ راست اُن کے مقدمے کی مِسل سے اخذ کی ہے۔ اِن وجوہات کی بنا پر اِن تینوں اشخاص کی سزاؤں کو ایک جیسا قرار دینے کا پروفیسر موصوف کا تجزیہ درست نہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اگر مولانا فضل حق نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا تو انگریزوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک بے ضرر اور ''غیر باغی'' معروف شخصیت کو خواہ مخواہ ملزموں کے

کٹہرے میں کھڑا کرنے کا تماشہ رچاتے اور اُسے مجرم قرار دے کر کالے پانی کی سزا کا مستحق ٹھہراتے! سزا دہی کے اِس عمل کی حکمت کے پیچھے تین مفروضے قائم کئے جاسکتے ہیں کہ:

مولانا نے بغاوت میں واقعی حصہ لیا تھا...... یا

اُن سے حکومت کو کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ تھا...... یا

انگریزوں کو اُن سے کوئی خاص قسم کی عداوت تھی۔

تینوں صورتیں مولانا کو انگریزوں کا مخالف ثابت کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی تالیف ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں مولانا عبدالحق صدر مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کے والد مولانا فضل حق خیر آبادی کے متعلق بلا وجہ نہیں لکھا تھا کہ

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالمِ دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کیا تھا اور جنہوں نے اپنے جُرموں کا خمیازہ اِس طرح بھگتا ہے کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دیئے جائیں۔ اِس غدار عالمِ دین کا کتب خانہ، جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا، اب کلکتہ میں موجود ہے۔'' [۴۲]

حوالہ جات

۱۔ ''غالب نام آدرم'' بحوالہ ''امتیازِ حق'' (راجا غلام محمد) مکتبہ قادریہ، لاہور (۱۹۷۹ء) ص ۱۰، ۲۔ مولانا فضل حق خیر آبادی (مرتبہ: افضل حق قرشی) الفیصل، لاہور (۱۹۹۲ء) ص ۱۵۵، ۳۔ Kotwal's Diary (Syed Mubarak Shah) Pakistan Historical Society, Karachi. (1994)p.49،

۴۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۸۹، ۵۔ ایضاً، ص ۹۰، ۶۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد (غلام رسول مہر) کتاب منزل، لاہور (۱۹۶۰ء) ص ۲۰۶، ۷۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۱۵۶، ۸۔ ایضاً، ۹۔ ایضاً، ص ۱۵۷، ۱۰۔

۱۸۵۷ء کے مجاہد،ص ۲۰۵ (حاشیہ)،۱۱۔ غدر کی صبح شام (جیون لال کی ڈائری)
ہمدرد پریس، دہلی (۱۹۲۶ء) ص ۲۲۰، ۱۲۔ ایضاً،ص ۱۰۸، ۱۳۔ ایضاً،
ص۱۰۹، ۱۴۔ ایضاً،ص۱۱۶، ۱۵۔ ایضاً،ص ۱۵۳، ۱۶۔ ایضاً،ص ۲۰۶،
۱۷۔ غداروں کے خطوط (سلیم قریشی / سیّد عاشور کاظمی) انجمن ترقی اردو، دہلی
(۱۹۹۳ء) ص ۱۳۸، ۱۸۔ غدر کی صبح شام،ص ۱۲۶، ۱۹۔ ایضاً،ص ۲۱۷،
۲۰۔ غداروں کے خطوط،ص ۱۳۲، ۲۱۔ غدر کے فرمان (مرتبہ: خواجہ حسن
نظامی) اہلِ بیت پریس، دہلی (۱۹۴۴ء) ص ۱۲۷، ۲۲۔ ایضاً،ص ۱۲۸۔۱۲۹
، ۲۳۔ Memoirs بحوالہ ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون'' (حکیم محمود
احمد برکاتی) برکات اکیڈمی، کراچی (۱۹۸۷ء) ص ۸۳ تا ۸۵، ۲۴۔ مولانا
فضل حق خیرآبادی،ص ۱۵۶، ۲۵۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ (عبداللطیف /
مترجمہ: خلیق احمد نظامی) ندوۃ المصنفین، دہلی (۱۹۵۸ء) ص ۱۶۲، ۲۶۔ ایضاً،
ص ۱۱۹، ۲۷۔ ایضاً،ص ۴۵، ۲۸۔ غدر کی صبح شام،ص ۱۵۱۔۱۵۲،
۲۹۔ ایضاً،ص ۱۶۵، ۳۰۔ ایضاً،ص ۱۸۷، ۳۱۔ غداروں کے خطوط،
ص ۱۵۴، ۳۲۔ ایضاً،ص ۱۵۹، ۳۳۔ ایضاً،ص ۱۶۴، ۳۴۔ ایضاً،ص ۱۷۰،
۳۵۔ مولانا فضل حق خیرآبادی،ص ۱۲۲ تا ۱۲۴، ۳۶۔ ایضاً،ص ۱۴۸، ۳۷۔
مقدمہ بہادر شاہ ظفر (مرتبہ: خواجہ حسن نظامی) الفیصل، لاہور (۱۹۹۰ء) ص ۱۶۱،
۳۸۔ ایضاً،ص ۱۶۳، ۳۹۔ مولانا فضل حق خیرآبادی،ص ۱۶۳، ۴۰۔ علماء ہند کا
شاندار ماضی (سیّد محمد میاں) الجمعیۃ پریس، دہلی (۱۹۶۰ء) جلد ۴،ص ۲۶۲، ۴۱۔
اردو صحافت (مرتبہ: انور علی دہلوی) اردو اکادمی، دہلی (۱۹۸۷ء) ص ۸۸۔۸۹،
۴۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان (ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر) اقبال اکیڈمی، لاہور
(۱۹۴۴ء) ص ۲۸۱

# سرسید، مرزا قادیانی اور انگریزی حکومت

انیسویں صدی کے آخری عشروں میں سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی بہت مشہور ہوئے۔ دونوں اپنے اپنے طور پر برطانوی حکومت کی حمایت میں نہایت شدت سے سرگرم عمل رہے اور مذہبی حوالوں کی بنیاد پر مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت کی تلقین کرتے رہے۔ مرزا قادیانی نے اس مقصد کے لئے مسلمانوں سے الگ ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور اپنے پیروکاروں کیلئے سلطنت انگریزی کا وفادار ہونا لازمی قرار دیا جبکہ سرسید نے دوسرے ذرائع کے علاوہ علی گڑھ کالج کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کا خواب دیکھا اور عمر بھر اپنے خطبات میں مسلمان عوام اور طلبہ کا سب سے بڑا فرض سرکار انگریزی کی خیر خواہی قرار دیتے رہے۔

۱۸۹۷ء کی یونان ترکی لڑائی میں ترکوں کی فتح پر ہندی مسلمانوں نے سلطان کو مبارک بادی کے تار روانہ کئے۔ سرسید کے لئے خوشی ناقابل برداشت تھی کیونکہ مسلمانوں کا یہ طرز عمل جہاں عظیم اسلامی ملک کی فتح کا جشن تھا وہاں ذہنی طور پر برطانوی حکومت کے خلاف جذبات کا اظہار بھی تھا جو اس دوران ترکوں کے خلاف سخت کلمات استعمال کرتی رہی تھی۔

سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اوپر تلے کئی مضمون مسلمانوں کے اظہار مسرت کے ان جذبات کے خلاف لکھے۔ ادوسری جانب مرزا قادیانی نے بھی حسب توقع اسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا۔ سرسید کو مرزا صاحب کا ایک مضمون بہت بھلا لگا اور انہوں نے اسے ''مرزا غلام احمد قادیانی'' کے زیر عنوان مندرجہ ذیل تبصرے کے ساتھ شائع کیا:

"مرزا صاحب نے جو اشتہار ۲۵ جون ۱۸۹۷ء کو جاری کیا ہے، اس اشتہار میں مرزا صاحب نے ایک نہایت عمدہ فقرہ گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور فاداری کی نسبت لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر ایک مسلمان کو، جو گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ مرزا صاحب نے لکھا ہے، اس لئے ہم اس فقرہ کو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی کی نسبت جو میرے پر حملہ کیا گیا ہے، یہ حملہ بھی محض شرارت ہے۔ سلطان روم کے حقوق بجائے خود ہیں مگر مگر اس گورنمنٹ کے حقوق بھی ہمارے سر پر ثابت شدہ ہیں اور ناشکر گزاری ایک بے ایمانی کی قسم ہے۔ اے نادانو! گورنمنٹ انگریزی کی تعریف تمہاری طرح میرے قلم سے منافقانہ نہیں نکلتی بلکہ میں اپنے اعتقاد اور یقین سے جانتا ہوں کہ در حقیقت خدا تعالیٰ کے فضل سے اس گورنمنٹ کی پناہ ہمارے لئے بالواسطہ خدا تعالیٰ کی پناہ ہے۔ اس سے زیادہ اس گورنمنٹ کی پر امن سلطنت ہونے کا اور کیا میرے نزدیک ثبوت ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ پاک سلسلہ (یعنی مرزائیت) اس گورنمنٹ کے ماتحت بر پا کیا ہے۔ وہ لوگ میرے نزدیک سخت نمک حرام ہیں جو حکام انگریزی کے روبروان کی خوشامدیں کرتے ہیں، ان کے آگے گرتے ہیں اور پھر گھر میں آ کر کہتے ہیں کہ جو شخص اس گورنمنٹ کا شکر کرتا ہے وہ کافر ہے۔

یاد رکھو کہ ہماری یہ کارروائی، جو اس گورنمنٹ کی نسبت کی جاتی ہے، منافقانہ نہیں ہے، ولعنتہ اللہ علی المنافقین بلکہ ہماری یہی عقیدہ ہے جو ہمارے دل میں ہے۔"

مرزا صاحب نے اس تبصرے کو برطانیہ کے ایک سند یافتہ عظیم خیر خواہ کی سند فضلیت سمجھتے ہوئے اس کا ذکر اپنی ایک تحریر میں یوں کیا:

"سر سید احمد خاں صاحب کے۔ سی۔ ایس۔ آئی نے جو اپنے آخری وقت میں یعنی موت سے تھوڑے دن پہلے میری نسبت ایک شہادت شائع کی ہے اس سے گورنمنٹ عالیہ سمجھ سکتی

ہے کہ اس دانا اور مردم شناس شخص نے میرے طریق اور رویہ کو بہ دل پسند کیا ہے"

پھر انہوں نے سرسید کا مذکورہ بالا حوالہ بڑے فخر سے درج کیا، گویا انگریز کی وفاداری کے متعلق سرسید کی شہادت ایک عظیم درجہ رکھتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مذکورہ اشتہار کے بارے میں لکھا:

"یہ مضمون خیر خواہی گورنمنٹ انگریزی میں میں نے اس وقت شائع کیا تھا جن دنوں میں مولوی محمد حسین بٹالوی اور دوسرے لوگوں نے سلطان روم کی تعریف میں مضمون لکھے تھے۔ اور بوجہ خیر خواہی اس گورنمنٹ کے مجھ کو کافر ٹھہرایا تھا۔ سید احمد خاں صاحب خوب جانتے تھے کہ کس قدر میں انگریزی گورنمنٹ کا خیر خواہ اور امن پسند انسان ہوں، اسی لئے میں نے ڈاکٹر کلارک کے مقدمہ میں سید صاحب کو اپنی فصائی کا گواہ لکھوایا تھا۔"

مرزا قادیانی اور سرسید کی انگریزی حکومت کی حمایت میں تحریروں کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو ان میں حیران کن حد تک لفظی و معنوی مشابہت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ستم ظریفی کی انتہا ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں سے ایک کو عوام دشمن اور انگریزوں کا پٹھو ثابت کرنے کے لئے اس کی یہی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں جبکہ دوسرے کے انہی الفاظ اور اسی مفہوم کی تحریروں کو اس کی دور اندیشی اور قوم کی خیر خواہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ذیل میں چند عنوانات کے تحت ان دونوں کی اس قسم کی تحریریں درج کی جاتی ہیں:

حضرت ملکہ معظمہ کے شصت سالہ جشن جوبلی شر شکرانے

مرزا قادیانی

ہم پر واجب ہے کہ ہم سچے دل سے، نہ نفاق سے، اس گورنمنٹ کے شکر گزار ہوں اور جناب قیصرۂ ہند دام ظلہا کی عمر و اقبال و دولت اور اس خاندان کے دوام اور

بقا کے لئے تہ دل سے دعا کریں کہ خدا تعالیٰ نے اس شکر اور ان دعاؤں کے لئے جشن جوبلی کا ہمیں ایک موقع دیا ہے اور یہ دن حقیقت میں ایک عظیم الشان خوشی کا موجب ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہماری ملکہ معظّمہ قیصرۂ ہند ام ظلہا کے شصت سالہ زمانہ تخت نشینی کو امن اور عافیت اور ترقی اقبال کے ساتھ پورا کیا۔

اس خدا کا شکر ہے جس نے آج ہمیں یہ عظیم الشان خوشی کا دن دکھلایا کہ ہم نے اپنی ملکہ معظّمہ قیصرۂ ہندوانگلستان کی شصت سالہ جوبلی کو دیکھا۔ جس قدر اس دن کے آنے سے مسرت ہوئی، کون اس کا اندازہ کرسکتا ہے؟ ہماری محسنہ قیصرۂ مبارکہ کو ہماری طرف سے خوشی اور شکر سے بھری ہوئی مبارکباد پہنچے۔ خدا ملکہ معظّمہ کو ہمیشہ خوشی سے رکھے۔

سرسید

ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم حضرت ملکہ معظّمہ قیصرۂ ہند کی اطاعت دل وجان سے کریں اور ان کی دولت اور حکومت کی درازی اور قیام واستحکام کی دعا کرتے رہیں اور اس بات کے اظہار کے لئے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہب کے احکام کے سچے پیرو ہیں اور اپنے عادل اور فرض رساں حاکم کی نہایت وفاداری اور خیر خواہی سے اطاعت کرتے ہیں، حضرت ملکہ معظّمہ کی شصت سالہ حکومت کی ایک یادگار قائم کرنی چاہیے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ...... گورنمنٹ انگلشیہ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں اور ملکہ معظّمہ وکٹوریا قیصرۂ انڈیا کی سلامتی اور درازی سلطنت کی دعا کرتے رہیں جس کی بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے۔

دنیا میں بے نظیر گورنمنٹ

مرزا قادیانی

میرا یہ دعویٰ ہے کہ تمام دنیا میں گورنمنٹ برطانیہ کی طرح کوئی دوسری ایسی

گورنمنٹ نہیں جس نے زمین پر ایسا امن قائم کیا ہو۔

اس علم دوست گورنمنٹ نے اظہار رائے میں وہ آزادی دی ہے جس کی نظیر اگر کسی اور موجودہ عمل داری میں تلاش کرنا چاہیں تو لاحاصل ہے۔

سرسید

انگریزی گورنمنٹ سے جس قدر ملک میں امن وامان اور رعایا میں آزادی ہے اس کی نظیر دنیا میں کسی گورنمنٹ میں نہیں ہے۔

ملکہ معظمہ......کی حکومت میں جو آزادی اور آسائش مسلمانوں کو حاصل ہے، وہ دنیا کی کسی حکومت میں نہیں ہے۔

ہندوستان میں مذہبی آزادی کے باعث جہاد جائز نہیں

مرزا قادیانی

ایسی گورنمنٹ سے، جو دین اسلام اور دینی رسوم پر کچھ دست اندازی نہیں کرتی اور نہ اپنے دین کو ترقی دینے کے لئے ہم پر تلواریں چلاتی ہے، قرآن شریف کی رو سے جنگ مذہبی کرنا حرام ہے۔

...... کیونکہ مسلمانان برٹش انڈیا اس گورنمنٹ برطانیہ کے نیچے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور کیونکہ آزادگی سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے پر قادر ہیں اور تمام فرائض منصبی بے روک ٹوک بجالاتے ہیں، پھر اس مبارک اور امن بخش گورنمنٹ کی نسبت کوئی خیال بھی جہاد کا دل میں لانا کس قدر ظلم اور بغاوت ہے!

سرسید

جس وقت تک مسلمان کامل امن وامان کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا وعظ کہہ سکیں اس وقت تک کسی مسلمان کے نزدیک اپنے مذہب کی رو سے اس ملک کے بادشاہ پر جہاد کرنا جائز نہیں ہے خواہ وہ کسی قوم کے کیوں نہ ہوں۔

جب گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں ہے اور مسلمانوں کی آزادی میں کسی طرح کا فتور نہیں ہے بلکہ درحقیقت ان کی تقریر کو بے انتہا آزادی ہے تو ایسی حالت میں کسی مسلمان کو ایسے منصوبوں میں شریک ہونا حلال نہ ہوگا جس کی بنا اس ارادہ پر ہو کہ گورنمنٹ انگریزی کو تہہ و بالا کر دیں۔

مستامن کے لئے جہاد حرام ہے

مرزا قادیانی

شریعت اسلام کا یہ واضح مسئلہ ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ایسی سلطنت سے لڑائی اور جہاد کرنا جس کے زیر سایہ مسلمان لوگ امن اور عافیت اور آزادی سے زندگی بسر کرتے ہوں اور جس کے عطیات سے ممنون منت اور مرہون احسان ہوں اور جس کی مبارک سلطنت حقیقت میں نیکی اور ہدایت پھیلانے کیلئے کامل مددگار ہو، قطعی حرام ہے۔

سرسید

اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا جس نے ان کو امن دیا ہو، مسلمان ہو یا کافر، اس کی اطاعت یا احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔

مسلمانوں کے مذہب بموجب ہماری گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں ہوسکتا کیونکہ تمام مسلمان ہندوستان کے برٹش گورنمنٹ کے امن میں ہیں اور مستامن ان لوگوں پر، جن کے امن میں ہے، جہاد نہیں کرسکتا۔

گورنمنٹ انگلشیہ خدا کی نعمت، رحمت اور برکت ہے

مرزا قادیانی

اگرچہ تمام ہندوستان پر یہ حق واجب ہے کہ بنظر ان احسانات کے جو سلطنت انگلشیہ سے اس کی حکومت اور آرام بخش حکمت کے ذریعہ سے عامہ خلائق پر وارد ہیں، سلطنت ممدوحہ کو خداوند تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھیں اور مثل اور نعماالٰہی کے اس کا

شکر بھی ادا کریں لیکن پنجاب کے مسلمان بڑے ناشکر گزار ہوں گے اگر وہ اس سلطنت کو، جو ان کے حق میں خدا کی ایک عظیم الشان رحمت ہے، نعمت عظمیٰ یقین نہ کریں...... یہ سلطنت ان کے لئے ایک آسمانی برکت کا حکم رکھتی ہے...... خداوند کریم ورحیم نے اس سلطنت کو مسلمانوں کے لئے ایک باران رحمت بھیجا ہے۔

سرسید

جس قدر مذہبی آزادی ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور جو امن وامان اس ملک کے درمیان پھیلا ہوا ہے، وہ خدا کی ایک نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا ہر مسلمان پر اور اس ملک کے ہر باشندے پر فرض ہے۔

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔

میں اس رول (Rule) یعنی حکومت کو ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میرے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے امن اور بہبودی کے لئے ایک بڑی برکت ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں کوئی مانع نہیں

مرزا قادیانی

خدا تعالیٰ نے انگریزوں کو ملک دیا اور انہوں نے ملک کے لئے کچھ ظلم نہ کیا، کسی کا نماز روزہ بند نہ کیا، کسی کو حج پر جانے سے منع نہ کیا بلکہ عام آزادی اور امن قائم کیا۔

کیسی عافیت اور امن کی گورنمنٹ کے زیر سایہ ہم لوگ رہتے ہیں جس نے ایک ذرہ مذہبی تعصب ظاہر نہیں کیا۔ کوئی مسلمان اپنے مذہب میں کوئی عبادت بجالائے، حج کرے، زکوۃ دے نماز پڑھے...... اس سے عادل گورنمنٹ کو کچھ سروکار نہیں۔

سرسید

ہم مسلمان ہندوستان میں بھی اس طرح پر رہتے ہیں کہ مذہبی معاملہ میں ہم کو ہر ایک قسم کی آزادی حال ہے، اپنے مذہبی فرائض کو بے کھٹکے ادا کرتے ہیں، جس قدر

بلند آواز سے چاہیں اذان دیتے ہیں۔

مسلمان اپنے مذہب کے مواقف مسجدیں بناتے ہیں اور اذانیں دیتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، کوئی روکنے والا اور منع کرنے والا نہیں۔

نوشیرواں عادل اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بمقابلہ ملکہ وکٹوریا اور رعایائے ہندوستان

مرزا قادیانی

یہ دعا گو...... اسی طرح وجود ملکہ معظّمہ قیصرۂ ہند اور اس کے زمانہ سے فخر کرتا ہے جیسا کہ سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشیرواں عادل کے زمانہ سے فخر کیا تھا۔ سو...... جلسہ جوبلی کی مبارک تقریب پر ہر ایک شخص پر واجب ہے کہ ملکہ معظّمہ کے احسانات کو یاد کر کے مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ مبارک باد دے اور حضور قیصرۂ ہند وانگلستان میں شکر گزاری کا ہدیہ گزارے۔

سرسید

نوشیرواں جو ایک آتش پرست بادشاہ تھا مگر عادل، اس کے عہد میں ہونے سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی خوشی وخوشنودی ظاہر فرمائی ہے...... پس ہم رعایائے ہندوستان جو ملکہ معظّمہ وکٹوریا دام سلطنتہا ملکہ ہند وانگلینڈ کی رعیت ہیں اور جو ہم پر عدل وانصاف، بغیر قومی یا مذہبی طرفداری کے حکومت کرتی ہے، سرتاپا احسان مند ہیں اور ہم پر ہمارے پاک اور روشن مذہب کی تعلیم سے ہم کو اس احسان مندی کا ماننا اور اس کا شکر بجالانا واجب ہے۔

سرسید

میرے عقیدہ میں مذہب اسلام دغا بازی اور فریب کا وسیلہ یا لٹیرے پن کا حیلہ نہیں ہے۔ اس کا سچا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے حاکم کے، جس کی امن میں رہتے ہیں اور امن میں زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے سچے خیر خواہ رہیں۔

## گورنمنٹ انگریزی کی اطاعت فرض اور واجب

### مرزا قادیانی

گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ اس گورنمنٹ کے وجود کہ خدا تعالیٰ کا فضل سمجھیں اور اس کی سچی اور اطاعت کی ایسی کوشش کریں کہ دوسروں کے لئے نمونہ ہو جائیں۔

### سرسید

ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً و فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔

حدیثوں کی رو سے لازم آتا ہے کہ تمام مسلمان جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں، نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں۔

## ذاتی خدمت و اطاعت محض مذہبی احکام کے تحت کی

### مرزا قادیانی

اس عاجز نے جس قدر...... انگریزی گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا ہے وہ صرف اپنے ذاتی خیال سے ادا نہیں کیا بلکہ قرآن شریف اور احادیث نبوی کی ان بزرگ تاکیدوں نے، جو اس عاجز کے پیش نظر ہیں، مجھکو شکر ادا کرنے پر مجبور کیا ہے۔

### سرسید

میں اپنی عالی قدر گورنمنٹ کا شکر گزار ہوں جس نے میری ناچیز، خدمتوں کی عزت کی...... میں نے گورنمنٹ کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ میں نے اپنے پاک مذہب اور سچے ہادی کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

## عادل گورنمنٹ سے مقابلہ بغاوت ہے نہ کہ جہاد

### مرزا قادیانی

کسی عادل گورنمنٹ کے سایہ معدلت کے نیچے رہ کر، جیسا کہ ہماری ملکہ معظّمہ قیصرۂ ہند کی سلطنت ہے، پھر اس کی نسبت بغاوت کا قصد کرنا اس کا نام جہاد نہیں ہے بلکہ یہ ایک نہایت وحشیانہ اور جہالت سے بھرا ہوا خیال ہے۔ جس گورنمنٹ کے ذریعہ سے آزادی سے زندگی بسر ہو اور پورے طور پر امن حاصل ہو اور فرائض مذہبی کما حقہ، ادا کر سکیں اس کی نسبت بدنیتی کو عمل میں لانا ایک مجرمانہ حرکت ہے نہ کہ جہاد۔

رعیت کا عادل بادشاہ کے ساتھ مقابلہ کرنا، اس کا نام بغاوت ہے نہ کہ جہاد۔

### سرسید

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے جو ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہے اور اس نے ہر طرح کی مذہبی آزادی عنایت کی ہے۔

یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ جس حاکم کی عملداری میں جو بطور رعیت ہو کر ان کے امن میں رہتے ہیں ان حاکموں سے مقابلہ کرنا بغاوت ہے نہ کہ جہاد۔

## خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اطاعت کا حکم

### مرزا قادیانی

مسلمانوں کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت ہوں، وفاداری سے اس کی اطاعت کریں۔

### سرسید

میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جن پر کہ میں یقین رکھتا ہوں، یہی حکم سمجھتا ہوں کہ جس حاکم کے امن میں رہیں اس کی اطاعت کریں۔

## اطاعت کے لئے حاکم کا مسلمان ہونا شرط نہیں

### مرزا قادیانی

ایک سچا مسلمان، جو اپنے دین سے واقعی خبر رکھتا ہو، اس گورنمنٹ کی نسبت جس کے ظل عاطفت کے نیچے امن کی زندگی بسر کرتا ہے ہمیشہ اخلاص اور اطاعت کا خیال رکھتا ہے اور مذہب کا اختلاف اس کو سچی اطاعت و فرمانبرداری سے نہیں روکتا......

اسلام ہمیں ہرگز یہ نہیں سکھلاتا کہ ہم ایک غیر قوم اور غیر مذہب والے بادشاہ کی رعایا ہو کر اور اس کے زیر سایہ ہر ایک دشمن سے امن میں رہ کر پھر اس کی نسبت بداندیشی اور بغاوت کا خیال دل میں لائیں۔

### سرسید

اسلام کا درست اور صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جو مسلمان کسی غیر مسلمان بادشاہ کی حکومت میں بطور رعیت کے مستامن ہو کر رہتے ہوں، ان کو مذہب اسلام کی رو سے اجازت نہیں ہے کہ وہ اس بادشاہ کے ساتھ کسی وقت دغابازی کریں یا فساد پھیلائیں۔

مذہب کی رو سے ہمارا فرض ہے کہ ہم بادشاہ وقت کی، گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، دل سے اطاعت کریں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے کہ اور فرمایا ہے کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو خواہ تمہارے ساتھ ظلم و ستم ہوتا ہو یا وہ انصاف اور مروت سے پیش آتے ہوں۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کسی مذہب کا ہو۔ جو لوگ اس ملک میں جہاں رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو صرف بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں، یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

# اذان کا شوق اور مساجد کے لاؤڈ سپیکر

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ دینی اور دنیوی مسائل کو حکایات کے پیرائے میں بیان کرنے کا اس قدر ملکہ رکھتے ہیں کہ ہر مسئلے کی جزئیات کا فلسفہ اور اس کا پس منظر ایک متحرک جسم کی مانند آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان کے اس قادر الکلامی اور مؤثر انداز بیان ہی نے انہیں عالم اسلام کے مفکرین میں ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان کا فارسی کلام آج بھی اس قدر مقبول ہے کہ اس کے تراجم متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دراصل عامۃ المسلمین دینی معاملات میں نہایت ہی جذباتی اور حساس واقع ہوئے ہیں لہٰذا کسی شخص کے لئے غلط طور پر مروجہ کسی مذہبی طریق کار کے بارے میں کھل کر براہ راست بات کرنا بھڑوں کا چھتہ چھیڑنے کے مترادف ہوتا ہے۔

ایسے مسائل کو حکایات کے کرداروں کی زبانی بیان کرنے میں مولانا روم علیہ الرحمہ کی ایک بہت بڑی مصلحت یہ بھی ہوگی کہ ناواجب فتاوٰی اور بے بنیاد شور و شر کی زد سے محفوظ رہیں۔ مؤذن کی کرخت آواز سے سننے والوں پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کے بارے میں انہوں نے مثنوی دفتر پنجم کی ایک حکایت میں اس مسئلہ کی نزاکت کو جس طرح اجاگر کیا ہے وہ ہر مسلمان کے لئے قابل فکر ہے۔ مذکورہ حکایت کا خلاصہ بیان کرنے یا اس کے بامحاورہ اردو ترجمے سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہو بہو لفظی ترجمہ پیش کیا جائے تاکہ کسی کو اس میں تحریف کا شبہ نہ رہے۔ اگرچہ اس طرح فارسی اشعار میں بیان کردہ بعض فقرات کے مفہوم اردو میں قابل وضاحت معلوم ہوتے ہیں مگر بنیادی تاثر پھر بھی قائم رہتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

اس بھدی آواز والے مؤذن کی حکایت جس نے نماز کے لئے کفرستان میں اذان دی اور ایک کافر شخص نے اس کو بہت سے تحفے دیئے۔''ایک مؤذن کی آواز بری تھی۔ وہ پوری پوری رات اپنا حلق پھاڑتا تھا۔ اس نے انسانوں پر میٹھی نیند حرام کر دی تھی۔ اس کی وجہ سے عوام وخواص سر درد میں مبتلا تھے۔ بچے بستروں میں اس سے ڈرتے تھے۔ مرد وعورت اس کی آواز سے عذاب میں تھے۔ وہ لوگ سر درد اور تکلیف کو رفع کرنے کے لئے چندہ جمع کرنے کو اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے اسے فوراً طلب کیا، نقدیاں دیں اور کہا کہ اے فلاں ہم سب نے آپ کی اذان سے راحت پائی۔ جناب آپ نے دن اور رات بڑا اکرم کیا۔ کیونکہ آپ کے باعث ہر ایک کو دولت میسر آ گئی ہے۔ اب کچھ مدت کے لئے ہماری نیند اڑ گئی ہے۔ آرام کی خاطر آپ اپنی زبان بند کر لیجئے اور اس کے بدلے میں باطنی توجہ فرمایئے......

''شدت شوق سے ایک قافلہ کعبہ کو روانہ ہوا۔ اس نے نقدی لی اور قافلہ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ قافلہ والوں نے رات کے وقت کفرستان کے مقام پر پڑاؤ کیا اپنی آواز کے عاشق مؤذن نے کفرستان میں اذان دے دی۔ بہت سے لوگوں نے اس سے کہا کہ نماز کے لئے اذان نہ دے ورنہ جنگ اور دشمنیاں ہو جائیں گی۔ اس نے جھگڑا کیا اور بہت لاپرواہی سے کفرستان میں اذان دی۔ اس عام فتنے سے لوگ ڈر گئے۔ ایک کافر کپڑے لئے ہوئے خود آیا۔ شمع اور حلوا اور ایک عمدہ لباس بطور تحفہ لایا اور ایک دوست کی طرح یہ پوچھتے ہوئے آیا کہ وہ مؤذن کہاں ہے جس کی آواز راحت بڑھانے والی ہے؟

''ہائیں'' اس بھدی آواز سے کیا راحت ملی جو اچانک اس آتش کدہ میں پہنچی؟

......''میری ایک پاکیزہ اور بہت خوب صورت لڑکی ہے جسے مؤمن بننے کی آرزو تھی۔ یہ جنون اس کے سر سے کبھی زائل نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے کافر اس کو نصیحتیں کرتے تھے،

اس کے دل میں ایمان کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ فکر انگیٹھی کی طرح تھی اور اس میں اگر کی لکڑی کی طرح میں عذاب اور درد اور شکنجہ میں تھا کیونکہ اس کا کوئی علاج نہ سمجھ پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس مؤذن نے اذان دی۔ لڑکی نے دریافت کیا کہ یہ مکروہ آواز کیسی ہے جس کے دو چار ٹکڑے میرے کان میں آئے ہیں؟ میں نے تمام عمر اس طرح کی بھدی آواز اس آتش کدہ اور بت خانے میں نہیں سنی۔ اس کی بہن نے کہا کہ یہ اذان کی آواز مومنوں کا اعلان اور علامت ہے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے دوسری سے پوچھا۔ دوسری نے بھی کہا، ہاں! اے چاند، جب اس کو یقین آ گیا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ مسلمانی سے اس کا دل افسردہ ہو گیا۔ میں پریشانی اور عذاب سے چھوٹ گیا اور گزشتہ رات خوب بے خوف نیند سویا۔ مجھے اس کی آواز سے یہ راحت پہنچی۔ وہ شخص کہاں ہے؟ میں شکرانہ میں تحفہ لایا ہوں جب اس نے اسے دیکھا تو کہا کہ یہ ہدیہ قبول کرو کیونکہ تم میرے مددگار اور پناہ دینے والے ہو۔ تم نے جو احسان اور بھلائی میرے ساتھ کی، میں ہمیشہ کے لئے تمہارا غلام ہو گیا ہوں۔ اگر میں صاحب مال و سلطنت اور دولت مند ہوتا تو سونے سے تمہارا منہ بھر دیتا۔ تمہارا ایمان مکر اور مجاز ہے اور اسی طرح کا ڈاکو ہے جیسے کہ وہ اذان۔

مولانا روم علیہ الرحمہ اس حکایت کے لبادے میں ایسی ''خطرناک'' باتیں کہہ گئے ہیں کہ اگر وہ انہیں براہ راست بیان کرتے تو گمراہ اور مطعون ٹھہرائے جاتے۔ غور کا مقام ہے کہ انہوں نے جس مؤذن کا ذکر کیا ہے اور وہ جو الفاظ ادا کرتا تھا وہ کوئی کفریہ کلمات نہیں تھے۔ وہ ان الفاظ کے ذریعے خدائے ذوالجلال کی عظمت کا اعلان کرتا تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتا تھا اور لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی طرف بلاتا تھا مگر مسلمان ان تمام باتوں پر ایمان رکھنے کے باوجود اس سے یکسر نالاں تھے۔ وہ ساری ساری رات درود و سلام کا ذکر باآواز کر کے اپنے یقین اور اعتماد

کے ساتھ اس کو ثواب اور ذریعہ اشاعت اسلام سمجھ کر ادا کر رہا تھا تا کہ پروردگار عالم اور اس کے پیارے رسول ﷺ کا نام بلند ہو مگر وہ اس کے منفی ردعمل کی سمجھ نہ رکھتا تھا۔ اپنی دینی خواہش کی تکمیل میں اس نے جو تکلیف دہ انداز اختیار کیا وہ ایک طرف تو خلق خدا کو اذیت دے کر اس کی بے زاری کا سبب بنا اور دوسری طرف اس نے اسلام کی طرف راغب غیر مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے سچا دین اختیار کرنے سے باز رکھا۔

رب جلیل نے انسانوں کو کانوں جیسی نازک نعمت سے نواز رکھا ہے جو نرم اور مناسب آواز تو قبول کرتے ہیں مگر کرخت آواز کانوں کے لئے ہی نہیں پورے جسم کے لئے ایک عذاب بن جاتی ہے اور طبیعت کو بے چینی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ صرف قوائے انسانی پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ انسان کے یقین اور ایمان کو بھی متزلزل کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کے برعکس اچھی آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ انداز میں تلاوت کرنے والوں کو لوگ خاموشی اور ادب کے ساتھ سنتے رہتے ہیں مگر خوش الحان قاری کی آواز پر وہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگتے ہیں اور اس کا خوش کن اثر ان کی طبیعتوں پر دیر تک رہتا ہے۔ مذکورہ حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی معاملات میں اگر ناواجب رویہ اختیار کیا جائے تو عبادات کے ضروری ارکان بھی مذہب سے لوگوں کے انحراف کی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں۔

اگر تعصب کو الگ رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم زمانے میں بدآواز مؤذن اپنی مکروہ آواز کے ذریعہ جو کارکردگی انجام دیتا تھا، وہی کام آج کے دور کے خوش الحان حضرات مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کی وساطت سے کر رہے ہیں۔ ایمپلی فائر کا پورا والیوم کھول کر اور مائیکروفون کے بالکل سامنے منہ لگا کر اپنی پوری آواز کے زور سے دوسروں کا جو حشر کیا جاتا ہے، وہ عامۃ المسلمین کو

مذہب اور مذہبی پیشواؤں سے بیزار کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رکھا جاتا کہ ہمارے ساتھ غیر مسلم بھی رہتے ہیں اور ہم ان پر کیا تاثر پیدا کر رہے ہیں۔ اس انداز میں اچھی سے اچھی آواز بھی ہیبت ناک شور کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ واعظین کا جوش خطابت سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے اور آواز بری طرح پھٹ کر سننے والوں کے کانوں کے پردوں میں زبردست ارتعاش پیدا کرتی ہے جس سے سخت کوفت بلکہ بعض اوقات اذیت ہوتی ہے۔ بولنے والے اس کیفیت سے نہیں گزرتے کیونکہ سپیکر ان سے فاصلے پر ہوتے ہیں اور ان کی اپنی آواز بھی یہ سارا شور عین اسی لمحے سننے کی راہ میں حائل ہوتی ہے اس تمام کیفیت سے وہی لوگ دوچار ہوتے ہیں جن تک وہ آوازیں براہ راست پہنچتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خود اس مسئلہ میں بہت جذباتی واقع ہوا تھا اور لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ فرائض وواجبات اور مستحبات ادا کرنے کے فلسفے کا شیدائی تھا اور اس امر کی دبی زبان میں مخالفت کرنے والوں کو اس بنیاد پر بے دین تصور کرتا تھا کہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر راحت پہنچاتا ہے نہ کہ تکلیف، میں سمجھتا تھا کہ معترضین کی شکایتیں ان کے ایمان کی کمزوری کی علامت ہیں۔ سب سے پہلے مجھے اس کی ایذا رسانی کا احساس اس وقت ہوا جب میں ایک مسجد سے متصل مکان خرید کر اس میں رہائش پذیر ہوا۔ چند ہی روز میں مرے سابقہ خیالات کا سارا فلسفہ ملیا میٹ ہو کر رہ گیا اور مجھے اس حقیقت سے شناسائی ہوئی کہ بینہ بے دین لوگوں کے اعتراضات نہ صرف جائز ہیں بلکہ شدید اہمیت کے حامل ہیں۔

اپنی دینی یا بے دینی کیفیت کی وضاحت کے لئے مجھے اس بات کا ذکر بامر مجبوری کرنا پڑ رہا ہے کہ میرا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی جس کی عمر چار، پانچ سال یا اس سے زیادہ ہو، فجر کی نماز بھی مسجد میں ادا کرتا ہے، لہٰذا علی الصبح لاؤڈ سپیکر سے اذان کی

آواز مجھے اس لئے بیزار نہیں کرتی کہ وہ میری یا میرے اہل خانہ کی نیند میں مخل ہوتی ہے۔ میں وہابی خیالات کا بھی حامل نہیں کہ نعت گوئی یا درود وسلام کی محفلیں مجھے اچھی نہ لگتی ہوں۔ اصل سبب لاؤڈ سپیکر کا ظالمانہ استعمال ہے جو دن کے وقت بھی سخت بے سکونی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ تصور کریں کہ ایک چھوٹی سی مسجد جس میں بغیر لاؤڈ سپیکر تقریر کی آواز ملحقہ مکان میں صاف سنی جا سکے، اس کے میناروں پر زبردست طاقت کے ایمپلی فائر کے ساتھ چار لاؤڈ سپیکر ارد گرد کے گھروں میں کیا کیفیت پیدا کرتے ہوں گے؟ یقین کیجئے کہ مجھے یوں احساس ہوتا کہ وہ آواز میرے کانوں کے ذریعہ چھاتی میں داخل ہو کر وہاں ہڈیوں میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے۔ درد اٹھنے لگتا اور میں بے چین ہو جاتا۔ اس حالت سے بچنے کے لئے اکثر اوقات کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لیا جا رہا ہو اور میری انگلیاں اس ذکر سے بچنے کے لئے کانوں میں ہوں، میں سوچنے لگا کہ یا تو میں کفر کی طرف راغب ہو رہا ہوں یا یہ ذکر نعوذ باللہ غلط ہے (اللہ تعالیٰ مجھے ان شکوک پر معاف فرمائے) مگر حقیقت میں میری اس سوچ کی دو باتیں غلط تھیں۔ نہ تو مجھ پر کفر غلبہ پا رہا تھا اور نہ ہی اس ذکر کی سچائی میں کوئی شک تھا۔ اصل مسئلہ ذکر پاک کی غلط انداز میں ادائیگی تھا۔ میری اہلیہ بھی بالکل اسی کیفیت سے دو چار ہوتیں۔

ہم نے کئی مرتبہ مطلقہ حضرات سے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم فرمایئے اور والیوم کو کم کھولا کیجئے۔ اسے زیادہ کھولنے پر اکثر ایمپلی فائر کی ایک مسلسل چیخ کانوں کے پردوں پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے مگر لاؤڈ سپیکر کے قابضوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ بچوں کو بھجوا کر یا خود جا کر والیوم کم کرواتے مگر اگلی اذان کے موقع پر مؤذن حضرات اسے پھر اوپر گھما دیتے۔ بڑے مصالحانہ انداز میں بار بار یہ سمجھا گیا کہ مائیکروفون سے تقریباً ایک فٹ پیچھے رہ کر بولنا اس کے استعمال کی

ہدایات میں درج ہوتا ہے کہ اس طرح آواز پھٹنے سے محفوظ رہتی ہے اور سامعین کی طبائع پر گراں نہیں گزرتی مگر وہ لوگ بضد تھے کہ منہ کو مائیکروفون کے بالکل ساتھ لائیں بلکہ ان کے بس میں ہوتو وہ اس کے اندر گھس کر اذان دیں۔

ہم کئی بار دروازہ بند ہو کر کمروں میں بیٹھ جاتے مگر آواز ذرا کم ہونے کے باوجود اس کی وہشت ناکی قائم رہتی۔ یقین جانیں کہ میں نے کئی مرتبہ لاؤڈ سپیکر کے اس طرح استعمال کے دوران اپنے سوتے ہوئے بچوں کو بری طرح تڑپتے دیکھا ہے اور شیر خوار بچے تو چیخیں مار کر اٹھ جاتے تھے۔ میں نے ہمسایوں کا بھی ایسا ہی حال دیکھا مگر حرف شکایت زبان پر لانا کسی کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ ایسا کرنا منتظمین کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کے مترادف تھا۔ وہ لوگ اس کیفیت کو معمول کی ایک آفت سمجھ کر سہے چلے آرہے ہیں۔ سیانے طالب علم امتحانوں کے دوران دوستوں یا عزیزوں کے ہاں منتقل ہو جاتے ہیں۔ گھر کے کسی فرد کی بیماری کی صورت میں اسے کسی ایسے رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا جاتا ہے جہاں مسجد کے لاؤڈ سپیکر کی آوازیں شدت سے نہ آتی ہوں۔ اس طرح دو خاندانوں کی تیمارداری کی براہ راست ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے کیونکہ اہل خانہ میں سے بھی کسی کو مریض کے ساتھ جانا پڑتا ہے اور باقیوں کو وقت بے وقت خیریت معلوم کرنے کے لئے۔

ان حالات میں مسجد اور شعائر اسلام کی حرمت، ان کے دلوں سے نکل رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت میں نے یہ دیکھا کہ مسجد سے ذرا فاصلے کے نمازی لوگ تو باقاعدگی کے ساتھ مسجد آتے مگر ہمسایوں کی اکثریت کم شریک ہوتی۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ بے نمازی تھے بلکہ یہ لاؤڈ سپیکر نواز افراد کے ناروا سلوک سے بددل ہو کر وہ مسجد سے ہی الرجک ہو گئے اور گھر میں الگ نمازیں پڑھنے لگے۔ بعض افراد کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ پکے نمازی تھے مگر مندرجہ بالا صورتحال کے بعد انہوں نے

نماز ہی ترک کر دی۔ اسے ان کے ایمان کی کمزوری کا نام دیا جائے یا کچھ اور اس سے غرض نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کی مسجد سے بیزاری میں منتظمین کا براہ راست حصہ ہے یا نہیں؟

اکثر دیکھا گیا ہے کہ عام محلوں میں پلنے بڑھنے والے لوگوں کے تعلقات اس قدر پختہ ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ عموماً کہیں اور منتقل ہونا پسند نہیں کرتے۔ بعض لوگ خواہش کے باوجود اپنی مجبوریوں کے تحت ایسا نہیں کر سکتے۔ چند سال وہاں رہائش کے بعد میں نے بالآخر مکان کو فروخت پر لگایا۔ پراپرٹی ڈیلر مکان خریدنے کے خواہش مندوں کو موقع پر لاتا تو ان میں سے بعض مسجد پر لگے لاؤڈ سپیکر دیکھ کر باہر سے ہی اسے ناپسند ہونے کا فیصلہ سنا دیتے۔ دو مرتبہ یوں ہوا کہ مکان کے معائنہ کے دوران اذان شروع ہو گئی۔ بعد میں پراپرٹی ڈیلر نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں نے مزید ایک شرط پیش کی ہے کہ انہیں وہ مکان دکھائے جائیں جو کسی مسجد کے قریب نہ ہوں۔ باوجود کوشش کے ایک سال تک سودا طے نہ ہو سکا۔ جب فروخت عمل میں آ گئی تو خدا کا شکر ادا کیا۔

اس ساری ذاتی تفصیل کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی معاملے میں ایک انسان جب تک خود ایک خاص کیفیت سے دوچار نہ ہو، اس کے تاثرات میں کسی غلطی یا کمی کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ مولانا روم بھی غالباً ان حالات سے گزرے ہوں گے جبھی انہوں نے اس کی جزئیات کو حکایت کے انداز میں بیان کیا۔ ممکن ہے کہ دیگر علماء، فضلاء نے بھی اس پر اظہار خیال کیا ہو۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے ایک فتویٰ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو اس مسئلے کی نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں فقہی طور پر جو مکتب واضح اکثریت رکھتا ہے موصوف ان کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں اور بدقسمتی سے لاؤڈ سپیکر کا بے جا

استعمال ایک وبا کی مانند زیادہ تر انہی کے معتقدین کی مساجد میں پھیلا ہوا ہے۔ اذان تو خیر ہر مسلک کے عقائد کا ایک لازمی جزو ہے مگر ان کے ہاں ثواب کے خیال سے وقت بے وقت سپیکر کے ذریعے مستحبات کی ادائیگی ایک معمول بن چکی ہے۔ کلام اللہ سے بڑھ کر اور کیا شے قابل تعظیم ہو سکتی ہے؟ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت باخیر و برکت ہوتی ہے مگر مناسب وقت اور جگہ کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے تو تلاوت کرنے والا ثواب کمانے کی بجائے الٹا گناہ گار ہوتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ نے ایک سوال کے جواب میں اس حقیقت کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

''جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں اور قرآن عظیم کے استماع کے لئے کوئی فارغ نہ ہو، وہاں جبراً تلاوت کرنے والے پر اس صورت میں دوہرا وبال ہے۔ ایک تو وہی خلل اندازی نماز وغیرہ، دوسرے قرآن عظیم کو بے حرمتی کیلئے پیش کرنا۔ ردالمختار میں ہے...... کہ اگر کوئی شخص فقہی مسائل لکھ رہا ہو اور اس کے پاس کوئی شخص قرآن مجید بلند آواز سے تلاوت کر رہا ہو تو گناہ تلاوت کرنے والے پر ہوگا۔ اسی بنا پر اگر کوئی بلند سطح پر آواز سے قرآن تلاوت کرے اور لوگ نیند میں ہوں جس سے لوگوں کی نیند میں خلل پڑتا ہو تو پڑھنے والا ہی گناہ گار ہوگا۔ یہ اس لئے کہ ایسی صورت میں قرآن کی تلاوت لوگوں کے قرآن سننے سے اعراض کا سبب بنتا ہے یا اس لئے کہ لوگوں کو نیند سے بیدار کرتے ہوئے ان کی اذیت کا باعث ہوتا ہے اور علامہ شامی نے غنیۃ کے حوالے سے لکھا ہے کہ قاری قرآن پر لازم ہے کہ وہ قرآن عظیم کے احترام کو ملحوظ رکھے اور بازاروں اور مصروفیات کے مقامات میں تلاوت نہ کرے اور اگر ایسے مقامات پر اس نے تلاوت کی تو اس سے قرآن پاک کی عزت و حرمت پامال ہوگی جس کا گناہ تلاوت کرنے والے پر ہوگا کیونکہ وہی قرآن پاک کی سماعت سے لوگوں

کو بے پرواہ کرنے کا باعث ہے۔ اس کا ذمہ دار مصروف لوگوں کو نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس میں لوگ حرج میں مبتلا قرار دیئے جائیں گے۔"

اس فتویٰ میں تلاوت کے حوالے سے لوگوں کی نیند میں خلل ڈالنے کا گناہ یا انہیں نیند سے بیدار کرنے میں "اذیت" کے الفاظ قابل غور ہیں جو کسی عام شخص کی زبانی ادا ہوں تو بعض لوگ سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ صبح کے وقت مساجد کے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے درس قرآن پاک پورے محلے کی عورتوں کے لئے گھر میں نماز فجر ادا کرنے میں خلل انداز ہوتا ہے اور لوگوں کو تلاوت میں دقت پیش آتی ہے۔ مساجد کے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے تلاوت فتویٰ کے الفاظ "بازاروں اور مصروفیات کے مقامات پر تلاوت" کے ضمن میں آتی ہے۔ اس فتویٰ کی روشنی میں اذان یا دیگر معاملات میں لاؤڈ سپیکر کے وحشیانہ استعمال سے عوام الناس کو اذیت پہنچانے اور شعائر اسلام کی بے حرمتی کے شرعی پہلو کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

# دو مکتوباتِ نقد و نظر

(1)

22-12-2021

## محترم و مکرم محمد کاشف رضا

اسلام علیکم!

ماہنامہ جہانِ رضا (لاہور) کا دسمبر 2021ء کا شمارہ آن لائن موصول ہوا۔ اس کے ص 6 تا 43 پر محترم محمد اعظم کا مضمون، رسالہ اجتہاد شائع ہوا ہے جو کہ حضرت فقیہ اعظم مولانا ابو یوسف محمد شریف محدث کوٹلوی (م۔ 1951) کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہفت روزہ الفقیہ (امرتسر) کے چند شماروں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ مضمون میں محترم اعظم نے اپنے آپ کو اس کا مرتب لکھا ہے اور اس کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

محترم کاشف عرض ہے کہ حضرت فقیہ اعظم کا مذکورہ رسالہ اجتہاد کے نام سے وزیر ہند پریس، امرتسر سے شائع ہوا تھا۔ (عکس ارسال خدمت ہے) تاریخ اشاعت درج نہیں ہے اس رسالہ کے مجموعی صفحات 26 ہیں۔ (چند صفحات پر کتب کے اشتہارات ہیں)

قطع نظر اس کے کہ حضرت فقیہ اعظم کے بارے میں محترم اعظم کے تحریر کردہ بعض حقائق خلاف حقیقت ہیں۔ میں صرف ریکارڈ کی درستگی کے لئے یہ تحریر ارسال کر رہا ہوں کہ یہ رسالہ پہلے سے ہی شائع شدہ ہے اور مذکورہ اشاعت سے

کہیں زیادہ مبسوط اور مکمل ہے۔ محترم اعظم کو الفقیہ سے جتنی اقساط ملی، انہوں نے جمع کر دیں اور حضرت فقیہ اعظم کے نام سے شائع کرانے کی سعادت حاصل کر لی۔ لیکن ان کو شاید یہ خیال نہ آیا کہ دنیا علم جس کو فقیہ اعظم سے پکارتی اور جانتی ہے اس کے سامنے، ان کی ایسی کمزور اور نامکمل تحریر پیش کر کے کوئی خدمت نہیں کی گئی۔ اگر محترم ''مرتب'' نے کوئی تدوین وتخریج کی ہوتی (جو کہ ان کا شعبہ نہیں) تو پھر بھی کوئی سعادت حاصل ہو جاتی۔ اکابرین کی کتب کے ساتھ جو آجکل ہو رہا ہے اور بعض احباب مصنفین بننے کی کوشش میں جو کارروائیاں کر رہے ہیں اس پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

مجیب احمد

اسلام آباد

(2)

30-12-2021

# جناب محمد کاشف رضاؔ صاحب

سلام مسنون!

جہان رضا شمارہ دسمبر 2021ء نظر نواز ہوا تحقیقی مضامین سے مزین پایا خصوصی طور پر مولانا محمد شریف کوٹلوی رحمہ اللہ کا اجتہاد پر لکھا گیا مضمون یقینی طور پر ایک علمی خزانہ ہے جس کی اشاعت پر ماہنامہ جہانِ رضا تحسین کا مستحق ہے۔

محمد یونس نوشاہی صاحب کا ''حیات رضا کے ایک نادر پہلو کی اولین اشاعت'' بھی ایک خاصے کی کاوش شمار کی جائے گی مگر اس میں اغلاط کی بھرمار نے اس کے حُسن کو زنگ آلود کر دیا اغلاط کی فہرست ذیل ہے۔

صفحہ نمبر 44 پیرہ نمبر 3 یادگار طرحی شاعرہ۔

صفحہ نمبر 44 پیرہ نمبر 2 میں 1930ء میں عالم جوانی میں تھے 1921ء میں ان کا وصال۔

صفحہ نمبر 44 صدارت کی سند پر حالانکہ مسند ہونا چاہئے تھا۔

صفحہ نمبر 45 شعرا کرم کا کلام حروف تہجی کی ترتیب سے دیا جا رہا ہے۔

حالانکہ حروف تہجی کی ترتیب نہ دارد

ستم بالائے ستم یہ کوتاہی کمپوزر کی شمار کی جائے گی یا آپکی یہ بات درست کہ 1903ء کو کمپوزر ہی کی نالائقی تصور کیا جائے گا مگر افسوس اس سارے مضمون کی پروف ریڈنگ آپ ہی کی کردہ ہے اور ذمہ داری بھی آپ پر عائد ہو گی صفحہ نمبر 52 پر

حضرت کے اشعار سن کر 15 منٹ تالیاں بجتی رہیں حضرت کے خلیفہ وجد میں آ گئے اور بے ہوش ہو گئے۔

العیاذ باللہ تعالیٰ حضرت رضا کی صدارت میں 15 منٹ تالیاں بجنا ناممکن محال ہے اور حضرت کے خلیفہ کا وجد میں آنا اور بے ہوش ہو جانا چہ معنی دارد صفحہ نمبر 53 پر اس تمام مشاعرہ کا واحد ماخذ ماہنامہ نیاز سیالکوٹ جنوری 1995ء پر بھی تحفظات ہیں کہ نومبر 1903 میں ہونے والے عدیم الشان مشاعرہ کی کارروائی 92 سال تک کیوں معدوم رہی اور ہندوستان کے جرائد سے کنارہ کش ہو کر ماہنامہ نیاز سیالکوٹ کی زینت بنا محققین اور نقاد حضرت کیلئے طبع آزمائی کی دعوت ہے۔

والسلام خیر الختام
محمد اکرم ربانی
(سمن آباد لاہور)

# الحقائق کی مطبوعات

## الحقائق پبلی کیشنز

دربار مارکیٹ گنج بخش روڈ لاہور

kashifraza786678@gmail.com

0333-7861895 0300-1090045